رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

عدد ۵

جلد ۵۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور پاکستان

قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

سالانہ چندہ ۶ روپے

خـــالی صفحـــه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۲	ماہ اگست ۱۹۵۹ء	عدد ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِشارات

پچھلی مرتبہ قربانی کی بحث نا تمام رہ گئی تھی۔ آج اسی سلسلہ میں چند مزید باتیں عرض کرنی ہیں۔ پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ:

قرآن مجید کی رو سے قربانی ہمیشہ سے تمام شرائع الٰہیہ کے نظامِ عبادت کا ایک لازمی جزر ہی ہے۔

قرآن واضح طور پر یہ بھی بتاتا ہے کہ الٰہی شریعتوں کے نظامِ عبادت میں کن وجوہ سے اس طریق عبادت کو شامل کیا گیا ہے۔

قرآن پچھلی امتوں کی طرح امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا حکم دیتا ہے، مگر قرآن میں اس کا ایک حکمِ عام دے کر اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنے رسولِ برحق پر چھوڑ دی کہ آپ اس پر عمل درآمد کی ایک شکل متعین کر دیں۔

اب ہمیں یہ بتانا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کیا شکل متعین فرمائی ہے، اور اس کا ثبوت کیا ہے کہ یہ شکل حضور ہی کی متعین فرمائی ہوئی ہے۔

اوّلاً، حضور نے یہ بات لوگوں کی مرضی پر نہیں چھوڑ دی کہ فرداً فرداً جس مسلمان کا جی چاہے اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی جانور قربان کر دے، بلکہ آپ نے تمام امت کے لیے تین دن مقرر فرما دیئے تاکہ تمام دنیا کے مسلمان ہر سال انہی خاص دنوں میں اپنی اپنی قربانیاں ادا کریں۔ یہ بات ٹھیک اسلام کے مزاج کے مطابق ہے۔ نماز کے معاملے

میں بھی یہی کیا گیا ہے کہ فرض نمازوں کو پانچوں وقت جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ ہفتے میں ایک مرتبہ جمعہ کی نماز لازم کی گئی تاکہ پنجوقتہ نمازوں سے زیادہ بڑے اجتماعات کی شکل میں مسلمان اسے ادا کریں، اور سال میں دو مرتبہ عیدین کی نمازیں مقرر کی گئیں تاکہ انہیں ادا کرنے کے لیے جمعہ سے بھی زیادہ بڑے اجتماعات منعقد ہوں۔ اسی طرح روزوں کے معاملہ میں بھی تمام مسلمانوں کے لیے ایک مہینہ مقرر کر دیا گیا تاکہ سب مل کر ایک ہی زمانے میں یہ فرض ادا کریں۔ اجتماعی عبادت کا یہ طریقہ اپنے اندر بے شمار فوائد رکھتا ہے۔ اس سے پورے معاشرے میں اُس خاص عبادت کا ماحول طاری ہو جاتا ہے جسے اجتماعی طور پر ادا کیا جا رہا ہو۔ اس سے مسلمانوں میں وحدت و یگانگت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے خدا پرستی کی اخلاقی و روحانی بنیاد پر مسلمان ایک دوسرے سے متحد اور دوسروں سے ممیز ہوتے ہیں۔ اور اس سے ہر وہ فائدہ بھی ساتھ ساتھ حاصل ہوتا ہے جو انفرادی طور پر عبادت بجالانے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

ثانیاً، اس کے لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر ایک یومِ عید مقرر فرمایا اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ سب مل کر پہلے دو رکعت نماز ادا کریں، پھر اپنی اپنی قربانیاں کریں۔ یہ ٹھیک قرآنی اشارے کے مطابق ہے۔ قرآن میں نماز اور قربانی کا ساتھ ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے اور نماز کو قربانی پر مقدم رکھا گیا ہے۔ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ۔ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ۔ پھر یہ مسلم معاشرے کی ایک اہم ضرورت بھی پوری کرتی ہے۔ ہر معاشرہ فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ اسے کچھ اجتماعی تہوار دیے جائیں جن میں اس کے سب افراد مل جل کر خوشیاں منائیں۔ اس سے ان میں ایک جذباتی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اور تہوار کی یہ خاص صورت کہ اس کا آغاز اللہ کی ایک عبادت، یعنی نماز سے ہو، اور اس کا پورا زمانہ اس طرح گزرے کہ ہر وقت کسی نہ کسی گھر میں اللہ کی ایک دوسری عبادت یعنی قربانی انجام دی جا رہی ہو، اور اس عبادت کے طفیل ہر گھر کے

لوگ اپنے دوستوں، عزیزوں، اور غریب ہمسایوں کو ہدیے اور تحفے بھی بھیجتے رہیں، یہ اسلام کی رُوح اور مسلم معاشرے کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اسلام ناچ رنگ اور لہو ولعب اور فسق وفجور کے میلے نہیں چاہتا۔ وہ اپنے بنائے ہوئے معاشرے کے لیے میلوں کی فطری مانگ ایسی ہی عید سے پوری کرنی چاہتا ہے جو خدا پرستی اور الفت ومحبت اور ہمدردی ومواسات کی پاکیزہ رُوح سے لبریز ہو۔

ثالثاً، اس کے لیے حضورؐ نے وہ خاص دن انتخاب فرمایا جس دن تاریخ اسلام کا سب سے زیادہ زریں کارنامہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے انجام دیا تھا۔ یعنی یہ کہ بوڑھا باپ اپنے رب کا ایک اشارہ پاتے ہی اپنے اکلوتے جوان بیٹے کو قربان کر دینے کے لیے ٹھنڈے دل سے آمادہ ہوگیا، اور بیٹا بھی یہ سُن کر کہ مالک اس کی جان کی قربانی چاہتا ہے، چھری تلے گردن رکھ دینے پر بخوشی راضی ہوگیا۔ اس طرح یہ محض قربانی کی عبادت ہی نہ رہی بلکہ ایک بڑے تاریخی واقعہ کی یادگار بھی بن گئی جو ایمانی زندگی کے اِس منتہائے مقصود، اُس کے اس آئیڈیل اور مثلِ اعلیٰ کو مسلمانوں کے سامنے تازہ کرتی ہے کہ انہیں اللہ کی رضا پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ قربانی کا حکم بجا لانے اور عید کا تہوار منانے کے لیے سال کا کوئی دن بھی مقرر کیا جا سکتا تھا۔ اس سے دوسرے تمام فوائد حاصل ہو جاتے، مگر یہ فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ اس کے لیے اِس خاص تاریخ کا انتخاب بیک کرشمہ دو کار کا مصداق ہے۔ ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس انتخاب کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے۔ آپ سے پوچھا گیا ما ھٰذہ الاضاحی، یہ قربانیاں کیسی ہیں؟ فرمایا سنۃ ابیکم ابراھیم، یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس واقعہ کے بعد ہر سال اسی تاریخ کو جانور قربان فرمایا کرتے تھے۔ حضورؐ نے اس سنت کو زندہ کیا اور اپنی امت کو ہدایت فرمائی کہ قرآن میں قربانی کا جو عام حکم دیا گیا ہے اس کی تعیین خصوصیت

کے ساتھ اُس روز کریں جس روز حضرت ابراہیمؑ اپنی اس عظیم الشان قربانی کی یاد تازہ کیا کرتے تھے۔ اپنی تاریخ کے یادگار واقعات کا "یوم" دنیا کی ہر قوم منایا کرتی ہے۔ اسلام کا مزاج یادگار منانے کے لیے بھی اُس دن کا انتخاب کرتا ہے جس میں دو بندوں کی طرف سے خدا پرستی کے انتہائی کمال کا مظاہرہ ہوا۔

رابعاً قربانی کے لیے اس دن کے انتخاب میں ایک اور مصلحت بھی تھی۔ ہجرت کے بعد پہلے ہی سال جب حج کا زمانہ آیا تو مسلمانوں کو یہ بات بُری طرح کھل رہی تھی کہ کفار نے اُن پر حرم کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس غم کی تلافی اس طرح فرمائی کہ ایامِ حج کو مدینے ہی میں ان کے لیے ایام عید بنا دیا۔ آپؐ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ ۹ ذی الحجہ (یعنی یوم الحج) کی صبح سے جبکہ حاجی عرفات کے لیے روانہ ہوتے ہیں، وہ ہر نماز کے بعد اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد کا ورد شروع کریں اور ۱۳ ذی الحج تک (یعنی جب تک حجاج منیٰ میں ایامِ تشریق گزارتے ہیں) اس کا سلسلہ جاری رکھیں۔ نیز ۱۰ ذی الحج کو جب کہ حجاج مزدلفہ سے منیٰ کی طرف پلٹتے ہیں اور قربانی اور طواف کی سعادت حاصل کرتے ہیں، وہ بھی دوگانہ نماز ادا کر کے قربانیاں کریں۔ یہ طریقہ فتح مکّہ سے پہلے تک تو مسلمانوں کے لیے گویا ایک طرح کی تسلّی کا ذریعہ تھا کہ حج سے محروم کر دیئے گئے تو کیا ہُوا، ہمارا دل حج میں مشغول ہے اور ہم اپنے گھر ہی میں بیٹھے ہوئے حجاج کے شریکِ حال ہیں۔ لیکن فتح مکّہ کے بعد اسے جاری رکھ کر عملاً اس کو تمام دنیا ئے اسلام کے لیے حج کی توسیع بنا دیا گیا۔ اس کے معنی یہ ہو گئے کہ حج صرف مکّہ میں حاجیوں تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ جس زمانے میں چند لاکھ حاجی وہاں مناسک حج ادا کر رہے ہوتے ہیں اسی زمانے میں ساری دنیائے اسلام کے کروڑوں مسلمان ان کے شریکِ حال ہوتے ہیں، ہر مسلمان، جہاں بھی وہ ہے، اس کا دل ان کے ساتھ ہوتا ہے، اس کی زبان اللہ اکبر کی تکبیر بلند کرتی رہتی ہے، وہ ان کی قربانی اور طواف کے وقت اپنی جگہ ہی نماز اور قربانی ادا کر رہا ہوتا ہے۔

خامساً، قربانی کا جو طریقہ حضورؐ نے سکھایا وہ یہ تھا کہ عید الاضحیٰ کا دوگانہ نماز ادا کرنے کے بعد قربانی کی جائے اور جانور ذبح کرتے وقت یہ کہا جائے:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَاشَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ. اَللّٰهُمَّ مِنْکَ وَلَکَ۔

میں نے یکسو ہو کر اپنا رخ اس ذات کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں بے شک میری نماز اور قربانی اور میرا مرنا اور جینا سب اللہ رب العلمین کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں۔ خدایا یہ تیرا ہی مال ہے اور تیرے ہی لیے حاضر ہے۔

ان الفاظ پر غور کیجیے۔ ان میں وہ تمام وجوہ شامل ہیں جن کی بنیاد پر قرآن مجید میں قربانی کا حکم دیا گیا ہے۔ ان میں اس بات کا اعلان ہے کہ دیوتاؤں کے لیے قربانیاں کرنے والے مشرکین کے برعکس ہم صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کے لیے قربانی کی عبادت بجا لا رہے ہیں۔ ان میں اس بات کا اعلان بھی ہے کہ اپنے پیدا کیے ہوئے جانوروں سے فائدہ اٹھانے کی جو نعمت اللہ تعالیٰ نے ہمیں بخشی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے یہ نذر ہم اس کے حضور پیش کر رہے ہیں۔ ان میں یہ اعلان بھی ہے کہ اس مال کے اصل مالک ہم نہیں ہیں، بلکہ یہ اللہ کے جانور ہیں جن پر اس نے ہم کو تصرف کا اختیار بخشا ہے، اور اس کی کبریائی کے اعتراف میں یہ نذرانہ ہم اس کے حضور گزران رہے ہیں۔ اس میں یہ اظہار بھی ہے کہ جس طرح ہمیں حکم دیا گیا تھا ٹھیک اسی طرح ہم ابھی صرف اللہ کے لیے نماز ادا کر کے آئے ہیں اور اب خالصتہً اسی کے لیے قربانی کے فرمان کی تعمیل کر رہے ہیں۔ پھر، ان سب سے بڑھ کر، ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ عہد و پیمان بھی ہے کہ ہماری نماز اور قربانی ہی نہیں، ہمارا مرنا اور جینا بھی صرف اسی کی ذات پاک

کے لیے ہے۔ اور یہ عہد و پیمان اُس تاریخی دن میں کیا جاتا ہے جس دن اللہ کے دو بندوں نے اپنے عمل سے بتایا تھا کہ جینا اور مرنا اللہ کے لیے ہونے کا مطلب کیا ہے۔

یہ پانچ نکات جو اوپر عرض کیے گئے ہیں انہیں ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیے۔ آپ کو ان میں ایک نبی کی خداداد بصیرت اور ہدایت یافتہ حکمت ایسی نمایاں نظر آئے گی کہ اگر اس قربانی کے سنتِ رسولؐ ہونے کی کوئی اور شہادت موجود نہ ہوتی تب بھی اُس کے اِس طریقے کی اندرونی شہادت خود یہ بتا دینے کے لیے کافی تھی کہ اس کو اسی خدا کے رسول نے مقرر کیا ہے جس خدا نے قرآن نازل کیا ہے۔ قرآن مجید میں قربانی کے متعلق جو کچھ اور جتنا کچھ ارشاد فرمایا گیا تھا اس کو پڑھ کر کوئی غیر نبی، چاہے وہ کتنا ہی بڑا عالم اور دانش مند ہی کیوں نہ ہوتا، اس سے زیادہ کوئی نتیجہ اخذ نہ کرتا کہ مسلمان وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ کے لیے قربانی کی عبادت بجا لاتے رہیں۔ وہ کبھی ان ارشادات سے یہ منشا نہ پا سکتا کہ ساری دنیائے اسلام کے لیے قربانی کا ایک دن مقرر کیا جائے، اس دن کو یوم العید قرار دیا جائے، وہ دن حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی قربانی کا دن ہونا چاہیے، وہ دن اور اس کے سابق و لاحق ایام زمانۂ حج کے بھی مطابق ہونے چاہئیں، اور یہ قربانی ایسے طریقے سے ادا کی جانی چاہیے کہ اس سے اسلام کی پوری رُوح تازہ ہو جائے۔ یہ منشا ایک نبی کے سوا اور کون پا سکتا تھا؟ اس منشا کو پانا اُس نبی کے سوا اور کس کا کام ہو سکتا تھا جس پر خدا نے اپنا قرآن نازل فرمایا تھا؟

مگر اس کے سنتِ رسول ہونے کی اِس اندرونی شہادت کے علاوہ اس کی خارجی شہادتیں بھی اتنی زیادہ اور اتنی مضبوط ہیں کہ بجز ایک ہٹ دھرم آدمی کے کوئی ان کا انکار نہیں کر سکتا۔

اس کی پہلی شہادت وہ کثیر روایات ہیں جو حدیث کی تمام معتبر کتابوں میں صحیح اور متصل سندوں کے ساتھ بہت سے صحابۂ کرام سے یہ بات نقل کرتی ہیں کہ حضورؐ نے عید الاضحیٰ کی

قربانی کا حکم دیا، خود اس پر عمل فرمایا اور مسلمانوں میں اس کو سنت الاسلام کی حیثیت سے رواج دیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں دس سال مقیم رہے اور ہر سال قربانی کرتے رہے (ترمذی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو وصیت کی تھی کہ میں آپ کی طرف سے قربانی کرتا رہوں، چنانچہ میں آپ کی طرف سے قربانی کیا کرتا ہوں۔ (ابوداؤد - ترمذی)

حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے دن خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں فرمایا کہ اول ما نبدأ بہ فی یومنا ھذا ان نصلی ثم نرجع فننحر فمن فعل ذالک فقد اصاب سنتنا "آج کے دن ہم پہلے نماز پڑھتے ہیں پھر پلٹ کر قربانی کرتے ہیں۔ پس جس نے اس طریقے کے مطابق عمل کیا اس نے ہماری سنت پالی" (بخاری، مسلم)

حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا الاضحیٰ یوم یضحی الناس "الاضحیٰ وہ دن ہے جس میں لوگ قربانی کرتے ہیں" (ترمذی)

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا من وجد سعۃ فلم یضح فلا یقربن مصلانا "جو شخص طاقت رکھتا ہو اور پھر قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے (مسند احمد - ابن ماجہ)

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ما عَمِلَ ابنُ آدم یومَ النحر عملاً احبَّ الی اللہ من ھراقۃ دمٍ "قربانی کے دن آدم کی اولاد کا کوئی فعل اللہ کو اس سے زیادہ پسند نہیں کہ وہ خون بہائے" (ترمذی - ابن ماجہ)

حضرت بریدہ کہتے ہیں کہ عید اضحیٰ کے دن حضورؐ عیدگاہ سے واپسی تک کچھ نہ کھاتے پیتے تھے اور واپس آکر اپنی قربانی کا گوشت تناول فرماتے تھے (مسند احمد)

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

عیدالضحیٰ کی نماز پڑھی، پھر جب آپ پلٹے تو آپ کے حضورؐ ایک مینڈھا لایا گیا اور آپ نے اسے ذبح فرمایا (مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد)

امام زین العابدین حضرت ابورافع سے روایت کرتے ہیں کہ حضور عیدالضحیٰ کے لیے دو موٹے تازے بڑے سینگوں والے چتکبرے مینڈھے خریدتے تھے اور عید کی نماز اور خطبے سے فارغ ہونے کے بعد ایک مینڈھا اپنی تمام امت کی طرف سے اور ایک اپنی اور اپنی آل کی طرف سے قربان فرماتے تھے (مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ ہی میں ذبح اور نحر فرمایا کرتے تھے (بخاری، نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد)

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدالاضحیٰ میں دو چتکبرے بڑے سینگوں والے مینڈھوں کی قربانی دی (بخاری، مسلم)، اور یہی مضمون حضرت جابر بن عبداللہ سے بھی مروی ہے (ابوداؤد، ابن ماجہ، بیہقی)

براء بن عازب، جندب بن سفیان البجلی، اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم کی متفقہ روایات یہ ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس شخص نے عید کی نماز سے پہلے ذبح کر لیا اس کی قربانی نہیں ہوئی، اور جو نماز کے بعد ذبح کرے اس کی قربانی ہو گئی اور اس نے سنتِ مسلمین پر عمل کیا (بخاری، مسلم، مسند احمد)

حضرت جابر عبداللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ہم کو قربانی کے دن نماز پڑھائی۔ اس کے بعد کچھ لوگوں نے آگے بڑھ کر حضورؐ سے پہلے قربانی کر لی۔ اس پر آپؐ نے حکم دیا کہ جس کسی نے ایسا کیا ہے اسے پھر قربانی کرنی چاہیے اور کسی کو اس وقت تک قربانی نہیں کرنی چاہیے جب تک کہ نبی اپنی قربانی نہ کر لے (مسلم، مسند احمد)

یہ روایات، اور بکثرت دوسری روایات جو احادیث میں آئی ہیں، سب اپنے مضمون میں متفق ہیں، اور کوئی ایک ضعیف سے ضعیف روایت بھی کہیں موجود نہیں ہے جو یہ بتاتی ہو کہ عیدالاضحیٰ کی یہ قربانی سنتِ رسول نہیں ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ

حج کے موقعہ پر مکہ معظمہ میں نہ کوئی عید الاضحیٰ منائی جاتی ہے اور نہ کوئی نماز قربانی سے پہلے پڑھی جاتی ہے، اس لیے ان تمام احادیث میں لازماً صرف اسی عید اور قربانی کا ذکر ہے جو مکہ سے باہر ساری دنیا میں ہوتی ہے۔

دوسری اہم شہادت عہدِ نبوت سے قریب زمانے کے فقہائے امت کی ہے جو سب بالاتفاق اس قربانی کو مسنون اور مشروع کہتے ہیں اور کسی ایک فقیہ کا قول بھی اس کے خلاف نہیں ملتا۔ ان فقہاء سے یہ بات بالکل بعید تھی کہ سب کے سب بلا تحقیق ایک فعل کو سنت مان بیٹھتے۔ اور وہ ایسے زمانے میں تھے جب یہ تحقیق کرنے کے تمام ذرائع موجود تھے کہ یہ کام جو مسلمان کر رہے ہیں یہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کردہ سنت ہی ہے یا کسی اور کی رائج کردہ بدعت۔

مثلاً امام ابوحنیفہ کو دیکھیے۔ وہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے درمیان صرف ۷۰ سال کا فاصلہ ہے۔ ان کے زمانے میں بعض طویل العمر صحابہ موجود تھے۔ اور ایسے لوگ تو ہزاروں کی تعداد میں جگہ جگہ پائے جاتے تھے جنھوں نے خلفائے راشدین کا زمانہ دیکھا تھا اور صحابۂ کرام کی صحبت پائی تھی۔ پھر کوفہ جو امام صاحب کا وطن تھا، کئی سال تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دارالخلافہ رہ چکا تھا۔ امام صاحب کی پیدائش اور حضرت علیؓ کی شہادت کے درمیان صرف ۴۰ سال کا زمانہ گزرا تھا۔ اس شہر میں ان لوگوں کا شمار نہ کیا جا سکتا تھا جو خلیفۂ رابع کا عہد دیکھ چکے تھے۔ کیا کوئی شخص تصور کر سکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کو یہ تحقیق کرنے میں کوئی مشکل پیش آ سکتی تھی کہ قربانی کا یہ طریقہ کب سے اور کیسے شروع ہوا ہے اور کس نے اسے جاری کیا ہے؟

اسی طرح امام مالک کی مثال لیجیے۔ وہ ۹۳ھ میں مدینۂ طیبہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ساری عمر گزاری۔ اس شہر میں سینکڑوں خاندان ایسے موجود تھے جن کے بڑے بوڑھوں

اور بڑی بوڑھیوں نے خلافتِ راشدہ کا عہد دیکھا تھا صحابہ کرام کی گودوں میں پرورش پائی تھی، اور جن کے اپنے بزرگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے۔ کیا کوئی شخص باور کر سکتا ہے کہ اس شہر کے لوگ اتنی قلیل مدت میں عہد نبوی کی روایات گم کر چکے تھے اور وہاں کوئی یہ بتانے والا نہ تھا کہ عیدالاضحیٰ کی یہ قربانی کس نے رائج کی ہے؟

یہی حال پہلی اور دوسری صدی ہجری کے تمام فقہاء کا ہے۔ وہ سب عہدِ نبوت سے اتنے قریب زمانے میں تھے کہ ان کے لیے سنت اور بدعت کی تحقیق کرنا کوئی بڑا مشکل کام نہ تھا اور وہ آسانی کے ساتھ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو سکتے تھے کہ جو چیز سنت نہ ہو اسے سنت سمجھ بیٹھیں۔

تیسری اہم ترین شہادت امت کے متواتر عمل کی ہے۔ عیدالاضحیٰ اور اس کی قربانی جس روز سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع کی اسی روز سے وہ مسلمانوں میں عملاً رائج ہو گئی اور اس وقت سے آج تک تمام دنیا میں پوری مسلم امت ہر سال مسلسل اس پر عمل کرتی چلی آرہی ہے۔ اس کے تسلسل میں کبھی ایک سال کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا ہے۔ ہر نسل نے پہلی نسل سے اس کو سنتِ اسلام کے طور پر لیا ہے اور بعد والی نسل کی طرف اسے منتقل کیا ہے۔ یہ ایک عالمگیر عمل ہے جو ایک ہی طرح دنیا کے ہر اُس گوشے میں ہوتا رہا ہے جہاں کوئی مسلمان پایا جاتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا متواتر عمل ہے جس کی زنجیر ہمارے عہد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک اس طرح مسلسل قائم ہے کہ اس کی ایک کڑی بھی کہیں سے غائب نہیں ہے۔ درحقیقت یہ ویسا ہی تواتر ہے جس تواتر سے ہم کو قرآن پہنچا ہے اور یہ خبر پہنچی ہے کہ چودہ سو سال پہلے عرب میں محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے۔ کوئی فتنہ پرداز اس تواتر کو بھی اگر مشکوک ٹھیرا دے تو پھر اسلام میں کیا چیز شک سے محفوظ رہ جاتی ہے۔

اس معاملے کی اصل نوعیت ہرگز نہیں ہے کہ ہماری تاریخ کا کوئی دور ایسا گزرا ہو جس میں

قربانی اور اس کی عید رائج نہ رہی ہو، پھر کسی قدیم نوشتے میں اس کا حکم لکھا ہوا مل گیا ہو اور کچھ ملاؤں نے اٹھ کر لوگوں سے کہا ہو کہ دیکھو فلاں جگہ ہم کو یہ لکھا ملا ہے لہٰذا آؤ مسلمانو، آؤ ہم عید الاضحیٰ منایا کریں اور اس میں جانوروں کی قربانی دیا کریں۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو تاریخ میں کہیں اس کا سراغ ملتا کہ یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا اور کون لوگ اس کے ذمہ دار تھے۔ پھر کسی ملا کی کبھی مسلمانوں میں یہ حیثیت نہیں رہی ہے کہ وہ کسی پرانے نوشتے سے ایک حکم نکال کر دکھائے اور تمام دنیا کے مسلمان بالاتفاق اور بے چون وچرا اس کی بات مان کر اس کی پیروی شروع کر دیں اور کوئی یہ نوٹ تک نہ کرے کہ یہ طریقہ پہلے ہم میں رائج نہ تھا، فلاں ملا صاحب کے کہنے سے اب حال ہی میں اس پر عمل شروع ہوا ہے۔

یہ تین قسم کی شہادتیں ایک دوسری سے پوری طرح مطابقت کر رہی ہیں۔ حدیث کی کثیر التعداد مستند و معتبر روایات، امت کے تمام معتمد علیہ فقہاء کی تحقیقات، اور پوری امت کا مسلسل و متواتر عمل، تینوں سے ایک ہی بات ثابت ہو رہی ہے۔ اس کے بعد اس امر میں کس شک کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ یہ طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا مقرر کیا ہوا ہے؟ اب اگر اس کے مقابلے میں کسی شخص کے پاس کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کی شہادت بھی ایسی ہے جس سے وہ یہ ثابت کر سکے کہ یہ حضور کا مقرر کیا ہوا نہیں ہے، تو وہ اسے سامنے لائے اور ہمیں بتائے کہ اسے کب، کس ملا نے، کہاں گھڑا اور کیسے تمام دنیا کے مسلمان اتنا بڑا دھوکا کھا گئے کہ اسے سنتِ رسولؐ مان لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ذہنی انحطاط اور اخلاقی تنزل کی اس سے زیادہ شرمناک تصویر اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ ہمارے درمیان جو شخص چاہتا ہے اٹھ کر ہمارے دین کے بالکل ثابت شدہ، مسلّم اور متفق علیہ حقائق کو، بلکہ اس کی بنیادوں تک کو بے تکلف چیلنج کر دیتا ہے اور دیکھتے دیکھتے اس کی تائید میں آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں، حالانکہ اس کے پاس اس کے اپنے مجرد دعوے کے سوا نہ کوئی دلیل

ہوتی ہے نہ شہادت۔

لے دے کر بس یہ ایک بات عوام کو فریب دینے کے لیے بڑی وزنی سمجھ کر بار بار پیش کی جاتی ہے کہ قربانی پر ہر سال لاکھوں روپیہ "ضائع" ہوتا ہے، اسے جانوروں کی قربانی کے بجائے رفاہِ عام یا قومی ترقی کے کاموں پر صرف ہونا چاہیے۔ لیکن یہ بات کئی وجوہ سے غلط ہے۔

اوّل یہ کہ جس چیز کا قرآن اور سنت سے حکمِ خدا اور رسول ہونا ثابت ہو اُس کے بارے میں کوئی مسلمان —— اگر واقعی وہ مسلمان ہے —— یہ خیال نہیں کر سکتا کہ اس پر مال یا وقت یا محنت صرف کرنا اسے ضائع کرنا ہے۔ ایسی بات جو شخص سوچتا ہے وہ اِن سب سے زیادہ قیمتی چیز یعنی اپنا ایمان ضائع کرتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اسلام کی نگاہ میں رفاہِ عام اور قومی ترقی کے کاموں کی بھی ایک قیمت ہے، مگر ان سے بدرجہا زیادہ قیمت اس کی نگاہ میں اس بات کی ہے کہ مسلمان شرک سے ہر طرح محفوظ ہوں، توحید پر ان کا عقیدہ ہر لحاظ سے خیال اور عمل میں مستحکم ہو، اللہ تعالیٰ کا شکر اور اس کی کبریائی کا اعتراف اور اس کی عبادت و بندگی بجا لانے کی عادت ان کی زندگی میں پوری طرح جڑ پکڑے رہے، اور وہ اللہ کی رضا پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے مستعد رہیں۔ ان مقاصد کے لیے جن کاموں کو اللہ اور اس کے رسول نے ضروری قرار دیا ہے ان میں سے ایک یہ قربانی بھی ہے۔ اس پر مال کا صرف رفاہِ عام اور قومی ترقی کے ہر کام سے بہت زیادہ قیمتی کام پر صرف ہے۔ اسے ضیاع صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کی قدریں اسلام کی قدروں سے اصلاً مختلف ہو چکی ہیں۔

تیسرے یہ کہ اللہ اور اس کے رسول نے جس عبادت کی جو شکل مقرر کر دی ہے، کوئی چیز اس کا بدل نہیں ہو سکتی، الّا یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحق نے خود ہی دو یا تین متبادل صورتیں تجویز کر کے ہمیں ان میں سے کسی ایک کا اختیار دے دیا ہو۔ ہمارا فرض ہر حکم کو اسی صورت میں بجا لانا ہے

جو شارع نے اس کے لیے مقرر کی ہے۔ ہم خود مختار بن کر اس کا بدل آپ ہی آپ تجویز نہیں کر سکتے۔ نماز کے بجائے اگر کوئی شخص اپنی ساری دولت بھی خیرات کر دے تو وہ ایک وقت کی نماز کا بدل بھی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح قربانی کے بجائے آپ خواہ کوئی بڑی سے بڑی نیکی بھی کر ڈالیں وہ عید الاضحیٰ کے تین دنوں میں جان بوجھ کر قربانی نہ کرنے کا معاوضہ ہر گز نہ بن سکے گی۔ بلکہ اگر یہ حرکت اس نظریے کی بنا پر کی جائے کہ اس عبادت کے لیے ہم نے خدا اور رسول کی مقرر کردہ صورت سے بہتر صورت تجویز کی ہے تو یہ نیکی کیسی، ایک بدترین معصیت ہو گی۔

پھر ذرا دینی نقطۂ نظر سے ہٹ کر محض اجتماعی نقطۂ نظر سے بھی اس "ضیاع" کے عجیب تصوّر پر غور کیجیے۔ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اپنی اجتماعی تقریبات پر، اپنے میلوں پر اور اپنے قومی اور بین الاقوامی تہواروں پر لاکھوں کروڑوں روپیہ صرف نہ کرتی ہو۔ اِن چیزوں کے تمدنی و اجتماعی اور اخلاقی فوائد اس سے بہت زیادہ ہیں کہ کوئی قوم محض دولت کے گز سے ان کو ناپے اور روپے کے وزن سے ان کو تولے۔ آپ یورپ اور امریکہ کے کسی سخت مادہ پرست آدمی کو بھی اس بات کا قائل نہیں کر سکتے کہ کرسمس پر ہر سال جو بے شمار دولت ساری دنیائے عیسائیت مل کر صرف کرتی ہے یہ روپے کا ضیاع ہے۔ وہ آپ کی اس بات کو آپ کے منہ پر مار دے گا اور بلا تامل یہ کہے گا کہ دنیا بھر میں بٹی ہوئی بے شمار فرقوں اور سیاسی قومیتوں میں تقسیم شدہ مسیحی ملّت کو اگر ایک بین الاقوامی تہوار بالاتفاق منانے کا موقع ملتا ہے تو اس کے اجتماعی اور اخلاقی فوائد اس کے خرچ سے بہت زیادہ ہیں۔ ہندوؤں جیسی زر پرست قوم تک اپنے میلوں اور تہواروں کو اُس مال کی میزان میں تولنے کے لیے تیار نہیں ہے جو ان تقریبات پر صرف ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہ چیز ان کے اندر وحدت پیدا کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ یہ نہ ہو تو ان کے تفرقے اور اختلافات اور طرح طرح کے باہمی امتیازات اتنے زیادہ ہیں کہ وہ کبھی جمع ہو کر ایک قوم نہ بن سکیں۔ یہی معاملہ ان دوسری اجتماعی تقریبات کا ہے جو دنیا کی

مختلف قومیں وقتاً فوقتاً مشترک طور پر مناتی ہیں۔ ہر ایک تقریب اپنی ایک محسوس صورت چاہتی ہے اور اس صورت کو عمل میں لانے پر بہت کچھ صرف ہوتا ہے۔ مگر کوئی قوم بھی یہ حماقت کی بات نہیں سوچتی کہ بس ہسپتال اور مدرسے اور کارخانے ہی ایک چیز ہیں جن پر سب کچھ لگ جانا چاہیے اور یہ تہوار اور تقریبات سب فضول ہیں۔ حالانکہ دنیا کی کسی قوم کی تقریبات اور تہواروں میں وہ بلند اور پاکیزہ روحانی، اعتقادی اور اخلاقی روح موجود نہیں ہے جو ہماری عیدالاضحیٰ میں پائی جاتی ہے، اور کسی تہوار اور تقریب کے منانے کی صورت ہر طرح کے شرک و فسق اور مکروہات سے اس درجہ خالی نہیں ہے جتنی ہماری عیدیں ہیں۔ اور کسی تہوار کے متعلق کسی قوم کے پاس خدا کی کتاب اور رسول کا حکم موجود نہیں ہے جیسا ہمارے پاس ہے۔ اب کیا ہم مادہ پرستی میں سب سے بازی لے جانے کا عزم کر چکے ہیں؟

اور یہ قربانی پر روپیہ "ضائع" ہونے کا آخر مطلب کیا ہے؟ یہ کہاں ضائع ہوتا ہے؟ قربانی کے لیے جو جانور خریدے جاتے ہیں ان کی قیمت ہماری ہی قوم کے ان لوگوں کی جیبوں میں تو جاتی ہے جو ان جانوروں کو پالتے اور ان کی تجارت کرتے ہیں۔ اسی کا نام اگر ضائع ہونا ہے تو اپنے ملک کے سارے بازار اور سب دوکانیں بند کر دیجیے، کیونکہ ان سے مال خریدنے پر کروڑوں روپیہ روز ضائع ہو رہا ہے۔ پھر جو جانور خریدے جاتے ہیں کیا وہ زمین میں دفن کر دیے جاتے ہیں یا آگ میں جھونک دیے جاتے ہیں؟ ان کا گوشت انسان ہی تو کھاتے ہیں۔ یہ اگر ضیاع ہے تو سال بھر انسانی خوراک پر جو کچھ صرف ہوتا رہتا ہے اس کے بند کرنے کی بھی کوئی سبیل ہونی چاہیے۔ اب کچھ لوگوں نے یہ محسوس کر کے کہ یہ ضائع ہونے کی بات چلتی نظر نہیں آتی، یہ افسانہ تراشا ہے کہ بقر عید میں بہت سا گوشت سڑ کر پھک جاتا ہے۔ حالانکہ ہم بھی اس ملک میں ایک مدت سے جی رہے ہیں، ہم کو تو کبھی سڑے ہوئے گوشت کے ڈھیر نظر نہیں آئے۔ وہ بتائیں انہیں کہاں ان کا دیدار میسر ہوا ہے۔

حال ہی میں ایک صاحب نے کچھ شرعی سہارے اس غرض کے لیے تلاش کیے ہیں کہ قربانی بند نہ سہی محدود ہی ہو جائے اور حکومت اسے محدود کر کے حدِ مقرر سے زائد قربانیوں کا روپیہ خیراتی کاموں میں صرف کرنے کا انتظام کر دے۔ ان سہاروں کی نوعیت بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔

وہ کہتے ہیں کہ قربانی صرف امام ابو حنیفہ کے نزدیک واجب ہے، باقی ائمۂ دین اسے صرف سنت مانتے ہیں۔ حالانکہ ان کی یہ بات بھی غلط ہے کہ اسے صرف امام اعظم واجب قرار دیتے ہیں، اور یہ بھی غلط کہ باقی ائمہ اسے سنت اس معنی میں مانتے ہیں کہ اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ جن ائمہ نے اسے واجب قرار دیا ہے ان میں امام مالک اور امام اوزاعی بھی شامل ہیں، اور امام شافعی وغیرہ جنہوں نے اسے سنت مانا ہے وہ سب اسے سنتِ موکدہ کہتے ہیں جس کا ترک جائز نہیں۔

ان کا بیان ہے کہ شارع کا منشا قربانی کو محدود کرنا تھا کیونکہ حضورؐ نے قربانی کا حکم صرف ذی استطاعت لوگوں کو دیا ہے اور حدیث میں یہ بھی فرمایا ہے کہ علی کل اہل بیت فی کل عام اضحیۃ وعتیرۃ (ہر گھر کے لوگوں پر ہر سال ایک قربانی بقر عید کی اور ایک رجب کی لازم ہے) حالانکہ ترمذی کے بقول یہ حدیث غریب اور ضعیف السند ہے اور ابو داؤد نے صراحت کی ہے کہ رجب کی قربانی کا حکم حضورؐ نے منسوخ فرما دیا تھا۔ تاہم اس بحث کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو سوال یہ ہے کہ شارع نے ایک چیز کو لازم کرتے ہوئے اگر اس کی ایک کم سے کم حد مقرر کی ہو تو کیا واقعی اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ شارع اس پر عمل کو محدود کرنا چاہتا ہے؟ نماز صرف پانچ وقت کی چند رکعتیں فرض ہیں۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ شارع نماز کو محدود رکھنا چاہتا ہے اور فرض رکعتوں سے زیادہ پڑھنا اسے پسند نہیں؟ روزے صرف رمضان کے فرض ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ روزوں کو محدود کرنا ہی مقصود ہے اور زائد روزے ناپسندیدہ ہیں؟ زکوٰۃ کی ایک محدود مقدار صرف صاحبِ نصاب پر لازم کی گئی ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کو محدود کرنا پیشِ نظر ہے اور غیر صاحبِ نصاب اگر راہِ خدا میں مال صرف کرے یا صاحبِ نصاب

زکوٰۃ کے علاوہ کچھ خیرات کرے تو یہ ناپسندیدہ بات ہوگی؟

وہ قرآن سے بعض نظیریں پیش کرتے ہیں کہ حج کی بعض رعایات سے فائدہ اٹھانے والوں اور بعض کوتاہیوں کا ارتکاب کرنے والوں پر جو قربانی لازم کی گئی ہے اس کا بدل روزوں کی شکل میں یا مالی انفاق کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے خود تجویز فرمایا ہے۔ اس سے وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ بقرعید کی قربانی کا بدل بھی اسی طرح تجویز کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ یہ استدلال اصولاً غلط ہے۔ وہاں شارع نے دو تین متبادل صورتیں ایک واجب سے سبکدوش ہونے کے لیے خود تجویز کی ہیں۔ یہاں آپ شارع کی ایک ہی مقرر کردہ شکلِ عبادت کا بدل تجویز فرما رہے ہیں۔ یہ اختیار آپ کو کس نے دیا ہے؟ کیا اسی طرح آپ نماز، روزے، زکوٰۃ، حج اور دوسرے فرائض و واجبات کے بدل بھی آپ ہی آپ تجویز کرلینے کے لیے آزاد ہیں؟

پھر وہ ہدایہ کی ایک عبارت سے یہ بالکل غلط مفہوم نکالتے ہیں کہ قربانی کے دنوں میں اگرچہ قربانی ہی کرنا افضل ہے، مگر اس کے بجائے جانور کی قیمت صدقہ کر دینا بھی جائز ہے۔ حالانکہ کوئی فقیہ اس بات کا قائل نہیں ہے کہ بقرعید کے ایام میں جانور کی قیمت کا صدقہ قربانی کا بدل ہوسکتا ہے۔ صاحبِ ہدایہ غریب کو اگر معلوم ہوتا کہ کسی وقت ان کے الفاظ التضحیۃ فیھا افضل من التصدق بثمن الاضحیۃ کا مطلب یہ نکالا جائیگا کہ قربانی کے دنوں میں قربانی کے بجائے جانور کی قیمت صدقہ کر دینا بھی درست ہے تو وہ دس بار اس پر توبہ کرتے۔ آخر فقہ حنفی کی ایک کتاب ہدایہ ہی تو نہیں ہے۔ دوسری بیشمار کتابیں بھی دنیا میں موجود ہیں اور قریب قریب سب ہی میں بالفاظِ صریح یہ بات لکھی گئی ہے کہ ان دنوں میں کوئی صدقہ قربانی کا بدل نہیں ہوسکتا۔

ایک دلچسپ استدلال ان کا یہ بھی ہے کہ اب لوگوں کے اندر خلوص تقویٰ کم ہے اور اس کے بجائے فخر اور ریا اور نام و نمود کی خاطر لوگ قربانیاں کرتے ہیں گویا جب یہی لوگ قربانی کے بجائے قومی فنڈ میں۔ اور وہ بھی سرکاری فنڈ میں بڑھ چڑھ کر چندے دیں گے تو اس وقت یہ کام غایت درجہ خلوص و تقویٰ کے ساتھ ہوگا۔ اس کے بعد بعید نہیں کہ ہر مسجد پر ایک محتسب خلوص پیما آلات لیے ہوئے موجود ہے اور اس سے ناپ ناپ کر ہر ریاکار نمازی کو حکم دے کہ نوافل اور سنتیں چھوڑ کر ان کے بدلے قومی فنڈ میں روپیہ داخل کرو۔

اِن کمزور سہاروں پر یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے کہ قربانی کو محدود کر دینا شریعت کے منشا کے منافی ہے:

تفہیم القرآن

النّمل

(۲)

(ایک اور موقع پر) سلیمان نے پرندوں کا جائزہ لیا[۲۷] اور کہا[۲۸] کیا بات ہے کہ میں فلاں ہُدہُد کو نہیں دیکھ رہا ہوں، کیا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے؟ میں اسے سخت سزا دونگا، یا ذبح کر دونگا، ورنہ اسے میرے سامنے معقول وجہ پیش کرنی ہوگی[۲۹]۔ کچھ زیادہ دیر نہ گزری

[۲۷] یعنی اُن پرندوں کا جن کے متعلق اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ جن اور انس کی طرح ان کے لشکر بھی حضرت سلیمان کے عساکر میں شامل تھے۔ ممکن ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ان سے خبر رسانی، شکار اور اسی طرح کے دوسرے کام لیتے ہوں۔

[۲۸] موجودہ زمانے کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہُدہُد سے مراد وہ پرندہ نہیں ہے جو عربی اور اُردو زبان میں اس نام سے معروف ہے بلکہ یہ ایک آدمی کا نام ہے جو حضرت سلیمان کی فوج میں ایک افسر تھا۔ اس دعوے کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ تاریخ میں کہیں ہُدہُد نام کا کوئی شخص ان حضرات کو سلیمان علیہ السلام کی حکومت کے افسروں کی فہرست میں مل گیا ہے، بلکہ یہ عمارت صرف اس استدلال پر کھڑی کی گئی ہے کہ حیا نوروں کے ناموں پر انسانوں کے نام رکھنے کا رواج تمام زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی پایا جاتا ہے اور عبرانی میں بھی تھا۔ نیز یہ کہ آگے اس ہُدہُد کا جو کام بیان کیا گیا ہے اور حضرت سلیمانؑ سے اس کی گفتگو کا جو ذکر ہے وہ ان کے نزدیک صرف ایک انسان ہی کر سکتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے سیاقِ کلام کو آدمی دیکھے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن کی تفسیر نہیں بلکہ اس کی تحریف، اور اس سے بھی کچھ بڑھ کر اس کی تغلیط ہے۔ آخر قرآن کو انسان کی عقل و خرد سے کیا دشمنی ہے کہ وہ

تھی کہ اس نے آکر کہا: میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں نہیں۔ میں کہنا تو یہ چاہتا ہوں کہ حضرت سلیمان کے رسالے یا پلٹن یا محکمۂ خبر رسانی کا ایک آدمی غائب تھا جسے انہوں نے تلاش کیا اور اس نے حاضر ہو کر یہ خبر دی اور اسے حضرت موصوف نے اس خدمت پر بھیجا لیکن اسے وہ مسلسل ایسی چیستاں کی زبان میں بیان کرے کہ پڑھنے والا اوّل سے لیکر آخر تک اسے پرندہ ہی سمجھنے پر مجبور رہے۔

دیکھیے، پہلے ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اللہ کے اس غیر معمولی فضل پر اظہارِ امتنان کیا کہ "ہمیں منطق الطیر کا علم دیا گیا ہے" اس فقرے میں اوّل تو طیر کا لفظ مطلق ہے جسے ہر عرب اور عربی داں پرندے ہی کے معنی میں لیگا، کیونکہ کوئی قرینہ اس کے استعارہ و مجاز ہونے پر دلالت نہیں کر رہا ہے۔ دوسرے، اگر طیر سے مراد پرند نہیں بلکہ انسانوں کا کوئی گروہ ہوتا تو اس کے لیے منطق (بولی) کے بجائے لسان (یعنی زبان) کا لفظ زیادہ صحیح ہوتا۔ اور پھر یہ کوئی بڑا غیر معمولی فضل نہ تھا کہ کسی شخص کو اگر کسی دوسرے انسانی گروہ کی زبان آجائے تو وہ خاص طور پر اس کمال کا ذکر کرے۔ آج ہمارے درمیان ہزارہا آدمی بہت سی غیر زبانوں کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔ یہ آخر کونسا بڑا کمال ہے

اس کے بعد فرمایا گیا کہ "سلیمان کے لیے جن اور انس اور طیر کے لشکر جمع کیے گئے تھے" اس فقرے میں اوّل تو جن اور انس اور طیر، تین معروف اسمائے جنس استعمال ہوئے ہیں جو تین مختلف اور معلوم اجناس کے لیے عربی زبان میں مستعمل ہیں۔ پھر انہیں مطلق استعمال کیا گیا ہے اور کوئی قرینہ ان میں سے کسی کے استعارہ و مجاز یا تشبیہ ہونے کا موجود نہیں ہے جس سے ایک آدمی لغت کے معروف معنوں کے سوا کسی اور معنی میں انہیں لے۔ پھر انس کا لفظ جن اور طیر کے درمیان آیا ہے جو یہ معنی لینے میں صریحًا مانع ہے کہ جن اور طیر دراصل انس ہی کی جنس کے دو گروہ تھے۔ یہ معنی مراد ہوتے تو الجن والطیر من الانس کہا جاتا نہ کہ من الجن والانس والطیر۔

اسی سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان طیر کا جائزہ لے رہے تھے اور ہُدہُد کو غائب دیکھ کر انہوں نے یہ بات فرمائی۔ اگر یہ طیر انسان تھے اور ہُدہُد بھی کسی آدمی کا نام ہی تھا تو کم از کم کوئی لفظ تو ایسا

سبا کے متعلق یقینی اطلاع لے کر آیا ہوں[۲۹]۔ میں نے وہاں ایک عورت دیکھی جو اس قوم کی

کہہ دیا جاتا کہ بیچارہ پڑھنے والا اس کو جانور نہ سمجھ بیٹھتا۔ گروہ کا نام پرندہ اور اس کے ایک فرد کا نام ہُدہُد، پھر بھی ہم سے توقع کی جاتی ہے کہ ہم آپ سے آپ اسے انسان سمجھ لیں گے۔

آگے چل کر حضرت سلیمان فرماتے ہیں کہ ہُدہُد یا تو اپنے غائب ہونے کی کوئی معقول وجہ بیان کرے ورنہ میں اسے سخت سزا دونگا یا ذبح کر دونگا۔ انسان کو قتل کیا جاتا ہے، پھانسی دی جاتی ہے، سزائے موت دی جاتی ہے، ذبح کون کرتا ہے؟ کوئی بڑا ہی سنگدل اور بے درد آدمی جوشِ انتقام میں اندھا ہو چکا ہو تو شاید کسی آدمی کو ذبح بھی کر دے، مگر کیا پیغمبر سے ہم یہ توقع کریں کہ وہ اپنی فوج کے ایک آدمی کو محض غیر حاضر ہونے کے جرم میں ذبح کر دینے کا اعلان کریگا، اور اللہ میاں سے یہ حُسنِ ظن رکھیں کہ وہ ایسی سنگین بات کا ذکر کر کے اس پر مذمت کا ایک لفظ بھی نہ فرمائیں گے؟

کچھ دور آگے چل کر ابھی آپ دیکھیں گے کہ حضرت سلیمان اسی ہُدہُد کو ملکۂ سبا کے نام خط دیکر بھیجتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اسے ان کی طرف ڈال دے یا پھینک دے (اَلقِہ الیھم)۔ ظاہر ہے کہ یہ ہدایت پرندے کو تو دی جا سکتی ہے لیکن کسی آدمی کو سفیر یا ایلچی یا قاصد بنا کر بھیجنے کی صورت میں یہ انتہائی غیر موزوں ہے۔ کسی کی عقل ہی خبط ہو گئی ہو تو وہ مان لیگا کہ ایک ملک کا بادشاہ دوسرے ملک کی ملکہ کے نام خط دیکر اپنے سفیر کو اس ہدایت کے ساتھ بھیج سکتا ہے کہ اسے لیجا کر اس کے آگے ڈال دے یا اس کی طرف پھینک دے۔ کیا تہذیب و شائستگی کے اس ابتدائی مرتبے سے بھی حضرت سلیمانؑ کو گرا ہوا فرض کر لیا جائے جس کا لحاظ ہم جیسے معمولی لوگ بھی اپنے کسی ہمسائے کے پاس اپنے ملازم کو بھیجتے ہوئے ملحوظ رکھتے ہیں؟ کیا کوئی شریف آدمی اپنے ملازم سے یہ کہہ سکتا ہے کہ میرا یہ خط لے جا کر فلاں صاحب کے آگے پھینک آ؟

یہ تمام قرائن صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں ہُدہُد کا مفہوم وہی ہے جو از روئے لغت اس لفظ کا مفہوم ہے، یعنی یہ کہ وہ انسان نہیں بلکہ ایک پرندہ تھا۔ اب اگر کوئی شخص یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ ایک ہُدہُد وہ باتیں کر سکتا ہے جو قرآن اس کی طرف منسوب کر رہا ہے تو اسے صاف صاف کہنا چاہیے کہ میں قرآن کی اس بات کو نہیں مانتا۔ اپنے عدمِ ایمان کو اس پردے میں چھپانا کہ قرآن کے صاف اور صریح الفاظ میں

حکمراں ہے۔ اس کو ہر طرح کا سرو سامان بخشا گیا ہے اور اس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے۔

اپنے من مانے معنی بھرے جائیں، گھٹیا درجے کی منافقت ہے۔

۲۹؎ سبا جنوبی عرب کی مشہور تجارت پیشہ قوم تھی جس کا دارالحکومت مارب، موجودہ یمن کے دارالسلطنت صنعاء سے ۵۵ میل بجانب شمال مشرق واقع تھا۔ اس کا زمانہ عروج مَعین کی سلطنت کے زوال کے بعد تقریباً ۱۱۰۰ق م سے شروع ہوا اور ایک ہزار سال تک یہ عرب میں اپنی عظمت کے ڈنکے بجاتی رہی۔ پھر ۱۱۵ق م میں جنوبی عرب کی دوسری مشہور قوم حِمیَر نے اس کی جگہ لے لی۔ عرب میں یمن اور حضرموت، اور افریقہ میں حبش کے علاقے پر اس کا قبضہ تھا۔ مشرقی افریقہ، ہندوستان، مشرق بعید اور خود عرب کی جتنی تجارت مصر و شام اور یونان و روم کے ساتھ ہوتی تھی وہ زیادہ تر انہی سبائیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اسی وجہ سے یہ قوم قدیم زمانہ میں اپنی دولت کے لیے نہایت مشہور تھی۔ بلکہ یونانی مؤرخین تو اسے دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم کہتے ہیں۔ تجارت کے علاوہ ان کی خوشحالی کا بڑا سبب یہ تھا کہ انہوں نے اپنے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر ایک بہترین نظام آب پاشی قائم کر رکھا تھا جس سے ان کا پورا علاقہ جنت بنا ہوا تھا۔ اُن کے ملک کی اس غیر معمولی سرسبزی و شادابی کا ذکر یونانی مؤرخین نے بھی کیا ہے اور سورہ سبا کے دوسرے رکوع میں قرآن مجید بھی اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ہُدہُد کا یہ بیان کہ "مَیں نے وُہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں" یہ معنی نہیں رکھتا کہ حضرت سلیمانؑ سبا سے بالکل ناواقف تھے۔ ظاہر ہے کہ فلسطین و شام کے جس فرمانروا کی سلطنت بحر احمر کے شمالی کنارے (خلیج عقبہ) تک پہنچی ہوئی تھی وہ اسی بحر احمر کے جنوبی کنارے (یمن) کی ایک ایسی قوم سے ناواقف نہ ہو سکتا تھا جو بین الاقوامی تجارت کے ایک اہم حصے پر قابض تھی۔ علاوہ ازیں زبور سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ سے بھی پہلے اُن کے والد ماجد حضرت داؤدؑ سبا سے واقف تھے۔ اُن کی دُعا کے یہ الفاظ زبور میں ہمیں ملتے ہیں:

"اے خدا، بادشاہ (یعنی خود حضرت داؤدؑ) کو اپنے احکام اور شاہزادے (یعنی حضرت سلیمان) کو اپنی صداقت عطا فرما . . . ترسیس اور جزیروں کے بادشاہ نذریں

میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کے بجائے سورج کے آگے سجدہ[۳۰] کرتی ہے" ــــ شیطان[۳۱] نے ان کے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیئے[۳۲] اور انہیں شاہراہ سے روک دیا، اس وجہ سے

گزرانیں گے۔ سبا اور شیبا (یعنی سبا کی یمنی اور حبشی شاخوں) کے بادشاہ ہدیے لائیں گے۔"

(۷۲: ۱-۲ و ۱۰-۱۱)

اس لیے ہُدہُد کے قول کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبا کے جو چشم دید حالات میں دیکھ کر آیا ہوں وہ ابھی تک آپ کو نہیں پہنچے ہیں۔

۳۰؎ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم اس زمانے میں آفتاب پرستی کے مذہب کی پیرو تھی۔ عرب کی قدیم روایات سے بھی اس کا یہی مذہب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ابنِ اسحاق علمائے انساب کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ سبا کی قوم دراصل ایک مورثِ اعلیٰ کی طرف منسوب ہے جس کا نام عبدِ شمس اور لقب سبا تھا۔ بنی اسرائیل کی روایات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں۔ ان میں بیان کیا گیا ہے کہ ہُدہُد جب حضرت سلیمان کا خط لیکر پہنچا تو ملکہ سبا سورج دیوتا کی پرستش کے لیے جا رہی تھی۔ ہُدہُد نے راستے ہی میں وہ خط ملکہ کے سامنے پھینک دیا۔

۳۱؎ اندازِ کلام سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سے آخر پیراگراف تک کی عبارت ہُدہُد کے کلام کا جز نہیں ہے بلکہ "سورج کے آگے سجدہ کرتی ہے" پر اس کی بات ختم ہو گئی اور اس کے بعد اب یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر بطورِ اضافہ ہے۔ اس قیاس کو جو چیز تقویت دیتی ہے وہ یہ فقرہ ہے: وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ "اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو۔" ان الفاظ سے یہ گمان غالب ہوتا ہے کہ متکلم ہُدہُد اور مخاطب حضرت سلیمان اور ان کے اہل دربار نہیں ہیں، بلکہ متکلم اللہ تعالیٰ اور مخاطب مشرکین مکہ ہیں جن کو نصیحت کرنے ہی کے لیے یہ قصہ سنایا جا رہا ہے۔ مفسرین میں سے علامہ آلوسی، صاحب روح المعانی بھی اسی قیاس کو ترجیح دیتے ہیں۔

۳۲؎ یعنی دنیا کی دولت کمانے اور اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ شاندار بنانے کے جس کام میں وہ منہمک ہیں، شیطان نے ان کو سجھا دیا کہ بس یہی عقل و فکر کا ایک مصرف اور قوائے ذہنی و جسمانی کا ایک استعمال ہے۔ اس سے زیادہ کسی چیز پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی حاجت ہی نہیں کہ تم خواہ مخواہ اس فکر

وہ یہ سیدھا راستہ نہیں پاتے کہ اُس خدا کو سجدہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں نکالتا ہے[۳۳] اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم لوگ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو[۳۴]۔ اللہ کہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، جو عرشِ عظیم کا مالک ہے[۳۵]۔

میں پڑ کر اس ظاہر حیاتِ دنیا کے پیچھے حقیقتِ واقعیہ کیا ہے اور تمہارے مذہب، اخلاق، تہذیب اور نظامِ حیات کی بنیادیں اُس حقیقت سے مطابقت رکھتی ہیں یا سراسر اس کے خلاف جا رہی ہیں۔ شیطان نے ان کو مطمئن کر دیا کہ جب تم دنیا میں دولت اور طاقت اور شان و شوکت کے لحاظ سے بڑھتے ہی چلے جا رہے ہو تو پھر تمہیں یہ سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ ہمارے یہ عقائد اور فلسفے اور نظریے ٹھیک ہیں یا نہیں۔ ان کے ٹھیک ہونے کی تو یہی ایک دلیل کافی ہے کہ تم مزے سے دولت کما رہے ہو اور عیش اڑا رہے ہو۔

۳۳ یعنی جو ہر آن اُن چیزوں کو ظہور میں لا رہا ہے جو آسمانوں اور زمین میں مخفی تھیں۔ انسانوں اور حیوانات میں ہر وقت بے شمار نئے افراد وجود میں لا رہا ہے جو پیدائش سے پہلے نہ معلوم کہاں کہاں پوشیدہ تھے۔ زمین کے پیٹ سے ہر آن بے شمار نباتات نکال رہا ہے اور طرح طرح کے معدنیات خارج کر رہا ہے عالمِ بالا کی فضاؤں سے وہ وہ چیزیں سامنے لا رہا ہے جن کے ظہور میں آنے سے پہلے انسان کا وہم و گمان بھی ان تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

۳۴ یعنی اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے، اس کے لیے ظاہر اور مخفی سب یکساں ہیں، اس پر سب کچھ عیاں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ان دو صفات کو بطورِ نمونہ بیان کرنے سے مقصود دراصل یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اگر وہ لوگ شیطان کے دھوکے میں نہ آتے تو یہ سیدھا راستہ انہیں صاف نظر آ سکتا تھا کہ آفتاب نامی ایک دہکتا ہوا کرہ، جو بیچارہ خود اپنے وجود کا ہوش بھی نہیں رکھتا، کسی عبادت کا مستحق نہیں ہے، بلکہ صرف وہ ہستی اس کا استحقاق رکھتی ہے جو علیم و خبیر ہے اور جس کی قدرت ہر لحظہ نئے نئے کرشمے ظہور میں لا رہی ہے۔

۳۵ اس مقام پر سجدہ واجب ہے۔ یہ قرآن کے اُن مقامات میں سے ہے جہاں سجدۂ تلاوت واجب ہونے پر فقہاء کا اتفاق ہے۔ یہاں سجدہ کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ایک مومن اپنے آپ کو

سلیمان نے کہا "ابھی ہم دیکھے لیتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے۔ میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کی طرف ڈال دے، پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں [۳۶]"

آفتاب پرستوں سے جدا کرے اور اپنے عمل سے اس بات کا اقرار و اظہار کرے کہ وہ آفتاب کو نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا مسجود و معبود مانتا ہے۔

۳۶ے یہاں پہنچ کر ہُدہُد کا کردار ختم ہوتا ہے۔ عقلیت کے مدعی حضرات نے جس بنا پر اسے پرندہ ماننے سے انکار کیا ہے وہ یہ ہے کہ انہیں ایک پرندے کا اس قوتِ مشاہدہ، قوتِ تمیز اور قوتِ بیان سے بہرہ ور ہونا بعید از امکان معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ملک پر گزرے اور یہ جان لے کہ یہ قوم سبا کا ملک ہے، اس ملک کا نظامِ حکومت یہ ہے، اس کی فرمانروا فلاں عورت ہے، اس کا مذہب آفتاب پرستی ہے، اس کو خدائے واحد کا پرستار ہونا چاہیے تھا مگر یہ گمراہی میں مبتلا ہے، اور پھر یہ سارے مشاہدات وہ آکر اس وضاحت کے ساتھ حضرت سلیمان سے بیان کر دے۔ انہی وجوہ سے کھلے کھلے ملاحدہ قرآن پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ کلیلہ دمنہ کی سی باتیں کرتا ہے، اور قرآن کی عقلی تفسیریں کرنے والے اس کے الفاظ کو ان کے صریح معنی سے پھیر کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ حضرت ہُدہُد تو سرے سے کوئی پرندے تھے ہی نہیں۔ لیکن ان دونوں قسم کے حضرات کے پاس آخر وہ کیا سائنٹفک معلومات ہیں جن کی بنا پر وہ قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہوں کہ حیوانات اور ان کی مختلف انواع اور پھر ان کے مختلف افراد کی قوتیں اور استعدادیں کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ جن چیزوں کو وہ معلومات سمجھتے ہیں وہ درحقیقت اس نہایت ناکافی مشاہدے سے اخذ کردہ نتائج ہیں جو محض سرسری طور پر حیوانات کی زندگی اور ان کے برتاؤ کا کیا گیا ہے۔ انسان کو آج تک کسی یقینی ذریعہ سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مختلف قسم کے حیوانات کیا جانتے ہیں، کیا کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں، کیا محسوس کرتے ہیں، کیا سوچتے اور سمجھتے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کا ذہن کس طرح کام کرتا ہے۔ پھر بھی جو تھوڑا بہت مشاہدہ مختلف انواع حیوانی کی زندگی کا کیا گیا ہے اس سے ان کی نہایت حیرت انگیز استعدادوں کا پتہ چلا ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ، جو ان حیوانات کا خالق ہے

ملکہ بولی "اے اہلِ دربار، میری طرف ایک بڑا اہم خط پھینکا گیا ہے۔ وہ سلیمان کی جانب سے ہے اور اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ مضمون یہ ہے کہ "میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ"۔ ع ع

ہم کو یہ بتاتا ہے کہ اس نے اپنے ایک نبی کو جانوروں کی منطق سمجھنے اور ان سے کلام کرنے کی قابلیت عطا کی تھی، اور اس نبی کے پاس سدھائے جانے اور تربیت پانے سے ایک ہدہد اس قابل ہو گیا تھا کہ دوسرے ملکوں سے یہ کچھ مشاہدے کر کے آتا اور پیغمبر کو ان کی خبر دیتا تھا، تو بجائے اس کے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے اس بیان کی روشنی میں حیوانات کے متعلق اپنے آج تک کے تھوڑے سے علم اور تجربے سے قیاسات پر نظرِ ثانی کریں، یہ کیا عقلمندی ہے کہ ہم اپنے اس ناکافی علم کو معیار قرار دے کر اللہ تعالیٰ کے اس بیان کی تکذیب یا اس کی معنوی تحریف کرنے لگیں۔

۳۷ یعنی خط کی اہمیت کئی وجوہ سے ہے۔ ایک یہ کہ وہ عجیب غیر معمولی طریقے سے آیا ہے۔ بجائے اس کے کہ کوئی سفارت اسے لا کر دیتی، ایک پرندے نے اسے لا کر مجھ پر ٹپکا دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ فلسطین و شام کے عظیم فرمانروا سلیمانؑ کی جانب سے ہے۔ تیسرے یہ کہ اسے اللہ رحمان ورحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے، حالانکہ دنیا میں کہیں کسی سلطنت کے مراسلوں میں یہ طریقہ استعمال نہیں کیا جاتا۔ پھر سب دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف خدائے بزرگ و برتر کے نام پر خط لکھنا بھی ہماری دنیا میں ایک غیر معمولی بات ہے۔ ان سب باتوں کے ساتھ یہ امر اس کی اہمیت کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے کہ اس میں بالکل صاف صاف ہم کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ ہم سرکشی چھوڑ کر اطاعت اختیار کریں اور تابع فرمان بن کر یا مسلمان ہو کر سلیمانؑ کے آگے حاضر ہو جائیں۔

"مسلم" ہو کر حاضر ہونے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مطیع بن کر حاضر ہو جاؤ۔ دوسرے یہ کہ دینِ اسلام قبول کر کے حاضر ہو جاؤ۔ پہلا مفہوم حضرت سلیمانؑ کی شانِ فرمانروائی سے مطابقت رکھتا ہے اور دوسرا مفہوم ان کی شانِ پیغمبری سے۔ غالباً یہ جامع لفظ اسی لیے استعمال کیا گیا ہے کہ خط میں یہ دونوں مقاصد شامل تھے۔ اسلام کی طرف سے خود مختار قوموں اور حکومتوں کو ہمیشہ یہی دعوت دی گئی ہے کہ

دخط سنا کر، ملکہ نے کہا "اے سردارانِ قوم، اس معاملے میں مجھے مشورہ دو، میں کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہیں کرتی ہوں۳۸" انہوں نے جواب دیا "ہم طاقتور ہیں اور لڑنے والے لوگ ہیں۔ آگے فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ آپ کو کیا حکم دینا ہے" ملکہ نے کہا کہ "بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اسے تباہ کر ڈالتے ہیں اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۳۹۔ یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں۴۰۔ میں اِن

یا تو دین حق قبول کرو اور ہمارے ساتھ نظام اسلامی میں برابر کے حصہ دار بن جاؤ، یا پھر اپنی سیاسی خود مختاری سے دست بردار ہو کر اسلامی نظام کی ماتحتی قبول کرو اور ید سے ہاتھ سے جزیہ دو۔

۳۸؎ اصل الفاظ ہیں حَتّٰی تَشْهَدُوْنَ، جب تک کہ تم حاضر نہ ہو، یا تم گواہ نہ ہو۔ یعنی اہم معاملات میں فیصلہ کرتے وقت تم لوگوں کی موجودگی میرے نزدیک ضروری ہے، اور یہ بھی کہ جو فیصلہ میں کروں اس کے صحیح ہونے کی تم شہادت دو۔ اس سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ کہ قوم سبا میں بادشاہی نظام تو تھا مگر وہ استبدادی نظام نہ تھا، بلکہ فرمانروائے وقت معاملات کے فیصلے اعیانِ سلطنت کے مشورے سے کرتا تھا۔

۳۹؎ اس ایک فقرے میں امپیریلزم اور اس کے اثرات و نتائج پر مکمل تبصرہ کر دیا گیا ہے۔ بادشاہوں کی ملک گیری اور فاتح قوموں کی دوسری قوموں پر دست درازی کبھی اصلاح اور خیر خواہی کے لیے نہیں ہوتی۔ اس کی غرض یہی ہوتی ہے کہ دوسری قوم کو خدا نے جو رزق دیا ہے اور جو وسائل و ذرائع عطا کیے ہیں ان سے وہ خود متمتع ہوں اور اس قوم کو اتنا بے بس کر دیں کہ وہ کبھی ان کے مقابلے میں سر اٹھا کر اپنا حصہ نہ مانگ سکے۔ اس غرض کے لیے وہ اس کی خوشحالی اور طاقت اور عزت کے تمام ذرائع ختم کر دیتے ہیں، اس کے جن لوگوں میں بھی اپنی خودی کا دم داعیہ ہوتا ہے انہیں کچل کر رکھ دیتے ہیں، اس کے افراد میں غلامی، خوشامد، ایک دوسرے کی کاٹ، ایک دوسرے کی جاسوسی، فاتح کی نقالی، اپنی تہذیب کی تحقیر، فاتح تہذیب کی تعظیم اور ایسے ہی دوسرے کمینہ اوصاف پیدا کر دیتے ہیں، اور انہیں بتدریج اس بات کا خوگر بنا دیتے ہیں کہ وہ اپنی کسی مقدس سے مقدس چیز کو بھی بیچ دینے میں تامل نہ کریں اور

لوگوں کی طرف ایک ہدیہ بھیجتی ہوں، پھر دیکھتی ہوں کہ میرے ایلچی کیا جواب لے کر پلٹتے ہیں"۔

جب وہ (ملکہ کا سفیر) سلیمان کے ہاں پہنچا تو اس نے کہا "کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں دیا ہے۔ تمہارا ہدیہ تمہی کو مبارک رہے۔ (اے سفیر) واپس جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف۔ ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا مقابلہ وہ نہ کر سکیں گے اور ہم انہیں ایسی ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے"۔

سلیمان نے کہا "اے اہل دربار، تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے قبل

اجرت پر ذلیل سے ذلیل خدمت انجام دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔

۳۹؎ اس فقرے میں دو برابر کے احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ملکۂ سبا ہی کا قول ہو اور اس نے اپنے پچھلے قول پر بطور تاکید اس کا اضافہ کیا ہو۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہو جو ملکہ کے قول کی تائید کے لیے جملۂ معترضہ کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہو۔

۴۰؎ اس جملے سے مقصود اظہار فخر و تکبر نہیں ہے۔ اصل مدعا یہ ہے کہ مجھے تمہارا مال مطلوب نہیں ہے بلکہ تمہارا ایمان مطلوب ہے، یا پھر کم سے کم جو چیز میں چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ تم ایک صالح نظام کے تابع ہو جاؤ۔ اگر تم ان دونوں باتوں میں سے کسی کے لیے راضی نہیں ہو تو میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ مال و دولت کی رشوت لے کر تمہیں اس شرک اور اس فاسد نظام زندگی کے معاملہ میں آزاد چھوڑ دوں مجھے میرے رب نے جو کچھ دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے کہ میں تمہارے مال کا لالچ کروں۔

۴۱؎ پہلے فقرے اور اس فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جو کلام پر غور کرنے سے خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے یعنی پوری بات یوں ہے کہ: اے سفیر یہ ہدیہ واپس لے جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف، انہیں یا تو ہماری پہلی بات ماننی پڑے گی کہ مسلم ہو کر ہمارے پاس حاضر ہو جائیں ورنہ ہم ان پر لشکر لے کر آئیں گے۔

اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں[۴۳]؟ جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا "میں اسے حاضر کر دونگا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں[۴۴]۔ میں اس کی طاقت

[۴۳] بیچ میں یہ قصہ چھوڑ دیا گیا ہے کہ سفارت ملکہ کا ہدیہ واپس لیکر پہنچی اور جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا تھا وہ عرض کر دیا۔ ملکہ نے اس سے حضرت سلیمان کے جو حالات سنے ان کی بنا پر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ خود ان کی ملاقات کے لیے بیت المقدس جائے۔ چنانچہ وہ خدم و حشم اور شاہی ساز و سامان کے ساتھ سبا سے فلسطین کی طرف روانہ ہوئی اور اس نے دربار سلیمانی میں اطلاع بھیج دی کہ میں آپ کی دعوت خود آپ کی زبان سے سننے اور بالمشافہ گفتگو کرنے کے لیے حاضر ہو رہی ہوں۔ ان تفصیلات کو چھوڑ کر اب اس وقت کا قصہ بیان کیا جا رہا ہے جب ملکہ بیت المقدس کے قریب پہنچ گئی تھی اور ایک دو ہی دن میں حاضر ہونے والی تھی۔

[۴۴] یعنی وہی تخت جس کے متعلق ہُدہُد نے بتایا تھا کہ "اس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے"۔ بعض مفسرین نے غضب کیا ہے کہ ملکہ کے آنے سے پہلے اس تخت کے منگانے کی وجہ یہ قرار دی ہے کہ حضرت سلیمان اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، انہیں اندیشہ ہوا کہ اگر ملکہ مسلمان ہو گئی تو پھر اس کے مال پر اس کی مرضی کے بغیر قبضہ کر لینا حرام ہو جائے گا، اس لیے انہوں نے اس کے آنے سے پہلے تخت منگا لینے کی جلدی کی کیونکہ اس وقت ملکہ کا مال مباح تھا۔ استغفر اللہ! ایک نبی کی نیت کے متعلق یہ تصور بڑا ہی عجیب ہے۔ آخر یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام تبلیغ کے ساتھ ساتھ ملکہ اور اس کے درباریوں کو ایک معجزہ بھی دکھانا چاہتے تھے تاکہ اسے معلوم ہو کہ اللہ رب العٰلمین اپنے انبیاء کو کیسی غیر معمولی قدرتیں عطا فرماتا ہے اور اسے یقین آ جائے کہ حضرت سلیمان واقعی اللہ کے نبی ہیں۔ اس سے بھی کچھ زیادہ غضب بعض جدید مفسرین نے کیا ہے۔ وہ آیت کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ "تم میں سے کون ہے جو ملکہ کے لیے ایک تخت مجھے لا دے"، حالانکہ قرآن یاتینی بعرش لھا نہیں بلکہ بعرشہا کہہ رہا ہے جس کے معنی "اس کا تخت" ہیں نہ کہ "اس کے لیے ایک تخت"۔ یہ بات صرف اس لیے بنائی گئی ہے کہ قرآن کے اس بیان سے کسی طرح پیچھا چھڑایا جائے کہ حضرت سلیمان اس ملکہ ہی کا تخت یمن سے بیت المقدس اٹھوا منگانا چاہتے تھے اور وہ بھی

رکھتا ہوں اور امانت دار ہوں ۔"[۴۶] جس شخص کے پاس کتاب کا ایک علم تھا وہ بولا " میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں ۔" [۴۷] جونہی کہ سلیمان نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا،

اس طرح کہ ملکہ کے پہنچنے سے پہلے پہلے وہ آ جائے ۔

[۴۵] اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جو جن تھے وہ آیا موجودہ زمانے کے بعض عقل پرست مفسرین کی تاویلوں کے مطابق بنی نوع انسان میں سے تھے یا عرفِ عام کے مطابق اسی پوشیدہ مخلوق میں سے جو جن کے نام سے معروف ہے ۔ ظاہر ہے کہ حضرت سلیمان کے دربار کی نشست زیادہ سے زیادہ تین چار گھنٹے کی ہو گی ۔ اور بیت المقدس سے سبا کے پایۂ تخت مارب کا فاصلہ پرندے کی اڑان کے لحاظ سے بھی کم از کم ڈیڑھ ہزار میل کا تھا ۔ اتنے فاصلہ سے ایک ملکہ کا عظیم الشان تخت اتنی کم مدت میں اٹھا لانا کسی انسان کا کام نہیں ہو سکتا تھا، خواہ وہ عمالقہ میں سے کتنا ہی موٹا تازہ آدمی کیوں نہ ہو ۔ یہ کام تو آج کل کا جٹ طیارہ بھی انجام دینے پر قادر نہیں ہے ۔ پھر مسئلہ اتنا ہی نہیں ہے کہ تخت کہیں جنگل میں رکھا ہو اور اسے اٹھا لایا جائے ۔ مسئلہ یہ ہے کہ تخت ایک ملکہ کے محل میں تھا جس پر یقیناً پہرہ دار متعین ہونگے اور وہ ملکہ کی غیر موجودگی میں ضرور محفوظ جگہ رکھا گیا ہو گا ۔ انسان جا کر اٹھا لانا چاہتا تو اس کے ساتھ ایک چھاپہ مار دستہ ہونا چاہیے تھا کہ لڑ بھڑ کر اسے پہرہ داروں سے چھین لائے ۔ یہ سب کچھ آخر دربار برخاست ہونے سے پہلے کیسے ہو سکتا تھا ۔ اس چیز کا تصور اگر کیا جا سکتا ہے تو ایک حقیقی جن ہی کے بارے میں کیا جا سکتا ہے ۔

[۴۶] یعنی آپ مجھ پر یہ بھروسا کر سکتے ہیں کہ میں اسے خود اڑا نہ لے جاؤنگا، یا اس میں سے کوئی قیمتی چیز نہ چرا لونگا ۔

[۴۷] اس شخص کے بارے میں قطعی طور پر یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ کون تھا، اور اس کے پاس وہ کس خاص قسم کا علم تھا، اور اس کتاب سے کونسی کتاب مراد ہے جس کا علم اس کے پاس تھا ۔ ان امور کی کوئی وضاحت نہ قرآن میں ہے نہ کسی حدیث صحیح میں ۔ مفسرین میں سے بعض کہتے ہیں کہ وہ فرشتہ تھا اور بعض کہتے ہیں کہ وہ کوئی انسان تھا ۔ پھر اس انسان کی شخصیت کے تعین میں بھی ان کے درمیان اختلاف ہے ۔ کوئی آصف بن برخیاہ

وہ پکار اٹھا "یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافرِ نعمت بن جاتا ہوں[۴۶]۔ اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے، ورنہ کوئی

(ASAF B-BERCHIAH) کا نام لیتا ہے جو یہودی ربیوں کی روایات کے مطابق رئیس الرجال (PRINCE OF MEN) تھے، کوئی کہتا ہے کہ وہ حضرت خضر تھے، کوئی کسی اور کا نام لیتا ہے، اور امام رازی کو اصرار ہے کہ وہ خود حضرت سلیمانؑ تھے۔ لیکن ان میں سے کسی کا بھی کوئی قابلِ اعتماد ماخذ نہیں ہے اور امام رازی کی بات تو قرآن کے سیاق و سباق سے بھی مطابقت نہیں رکھتی۔ اسی طرح کتاب کے بارے میں بھی مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس سے مراد لوحِ محفوظ ہے اور کوئی کتابِ شریعت مراد لیتا ہے۔ لیکن یہ سب محض قیاسات ہیں۔ اور ایسے ہی قیاسات اس علم کے بارے میں بھی بلا دلیل و ثبوت قائم کر لیے گئے ہیں جو کتاب سے اس شخص کو حاصل تھا۔ ہم صرف اتنی ہی بات جانتے اور مانتے ہیں جتنی قرآن میں فرمائی گئی ہے یا جو اس کے الفاظ سے مترشح ہوتی ہے۔ وہ شخص بہرحال جن کی نوع میں سے نہ تھا اور بعید نہیں کہ وہ کوئی انسان ہی ہو۔ اس کے پاس کوئی غیر معمولی علم تھا اور وہ اللہ کی کسی کتاب (الکتاب) سے ماخوذ تھا۔ جن اپنے وجود کی طاقت سے اس تخت کو چند گھنٹوں میں اٹھا لانے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ یہ شخص علم کی طاقت سے اس کو ایک لحظہ میں اٹھا لایا۔

۴۶ قرآن مجید کا اندازِ بیان اس معاملہ میں بالکل صاف ہے کہ اس دیو ہیکل جن کے دعوے کی طرح اس شخص کا دعویٰ صرف دعویٰ ہی نہ رہا بلکہ فی الواقع جس وقت اس نے دعویٰ کیا اسی وقت ایک ہی لحظہ میں وہ تخت حضرت سلیمانؑ کے سامنے رکھا نظر آیا۔ ذرا ان الفاظ پر غور کیجیے:

"اس شخص نے کہا میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لے آتا ہوں۔ جونہی کہ سلیمان نے اسے اپنے پاس رکھا دیکھا"

جو شخص بھی واقعہ کے عجیب و غریب ہونے کا تصور ذہن سے نکال کر بجائے خود اس عبارت کو پڑھے گا وہ اس سے یہی مفہوم لیگا کہ اس شخص کے یہ کہتے ہی دوسرے لمحہ میں وہ واقعہ پیش آ گیا جس کا اس نے دعویٰ کیا تھا۔ اس سیدھی سی بات کو خواہ مخواہ تاویل کے خراد پر چڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔

ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے[۴۹]۔"

پھر تخت کو دیکھتے ہی حضرت سلیمانؑ کا یہ کہنا کہ "یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ مجھے آزماتے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافرِ نعمت بن جاتا ہوں، اسی صورت میں برمحل ہو سکتا ہے جبکہ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہو۔ ورنہ یہ بات کہ ان کا ایک ہوشیار ملازم ملکہ کے لیے جلدی سے ایک تخت بنا لایا یا بنوا لایا اپنے اندر کوئی ایسی ندرت نہیں رکھتی کہ اس پر حضرت سلیمان بے اختیار ھٰذا من فضلِ ربّی پکار اٹھیں اور ان کو یہ خطرہ لاحق ہو کہ اتنے جلدی مہمانِ عزیز کے لیے تخت تیار ہو جانے سے کہیں میں شاکرِ نعمت بننے کے بجائے کافرِ نعمت نہ بن جاؤں۔ آخر اتنی سی بات پر کسی مومن فرمانروا کو اتنا غرور اور کبرِ نفس لاحق ہو جانے کا کیا خطرہ ہو سکتا ہے، خصوصاً جبکہ وہ ایک معمولی مومن نہ ہو بلکہ اللہ کا نبی ہو۔

اب رہی یہ بات کہ ڈیڑھ ہزار میل سے ایک تختِ شاہی پلک جھپکتے کس طرح اٹھ کر آ گیا، تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ زمان و مکان اور مادہ و حرکت کے جو تصورات ہم نے اپنے تجربات و مشاہدات کی بنا پر قائم کیے ہیں ان کے جملہ حدود صرف ہم ہی پر منطبق ہوتے ہیں۔ خدا کے لیے نہ یہ تصورات صحیح ہیں اور نہ وہ ان حدود سے محدود ہے۔ اس کی قدرت ایک معمولی تخت تو درکنار، سورج اور اس سے بھی زیادہ بڑے سیاروں کو آن کی آن میں لاکھوں میل کا فاصلہ طے کرا سکتی ہے۔ جس خدا کے صرف ایک حکم سے یہ عظیم کائنات وجود میں آ گئی ہے اس کا ایک ادنیٰ اشارہ ہی ملکہ سبا کے تخت کو روشنی کی رفتار سے چلا دینے کے لیے کافی تھا۔ آخر اسی قرآن میں یہ ذکر بھی تو موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک رات اپنے بندے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے بیت المقدس لے بھی گیا اور واپس بھی لے آیا۔

۴۹۔ یعنی وہ کسی کے شکر کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی خدائی میں کسی کی شکر گزاری سے نہ ذرہ برابر کوئی اضافہ ہوتا ہے اور نہ کسی کی ناشکری و احسان فراموشی سے یک سرِ مو کوئی کمی آتی ہے۔ وہ آپ اپنے ہی بل بوتے پر خدائی کر رہا ہے بندوں کے ماننے یا نہ ماننے پر اس کی خدائی منحصر نہیں ہے۔ یہی بات قرآن مجید میں ایک جگہ حضرت موسیٰ کی زبان سے نقل کی گئی ہے کہ اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ حَمِیْدٌ "اگر تم اور ساری دنیا والے مل کر بھی کفر کریں تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے"۔ (ابراہیم۔ رکوع ۲)۔ اور یہی مضمون اس حدیث

سلیمانؑ نے کہا "انجان طریقے سے اس کا تخت اس کے سامنے رکھ دو، دیکھیں وہ صحیح بات تک پہنچتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو راہِ راست نہیں پاتے"[۵۱]۔ ملکہ جب حاضر ہوئی تو اس سے کہا گیا کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ وہ کہنے لگی "یہ تو گویا وہی ہے"[۵۲]۔ ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے

قدسی کا ہے جو صحیح مسلم میں وارد ہوئی ہے کہ:

یقول اللہ تعالیٰ یا عبادی لو ان اولکم واٰخرکم وانسکم وجنکم کانوا علیٰ اتقیٰ قلب رجل منکم مازاد ذالک فی ملکی شیئًا۔ یا عبادی لو ان اولکم واٰخرکم وانسکم وجنکم کانوا علیٰ افجر قلب رجل منکم مانقص ذالک فی ملکی شیئًا۔ یا عبادی انما ھی اعمالکم احصیھا لکم ثم اوفیکم ایاھا۔ فمن وجد خیرًا فلیحمد اللہ ومن وجد غیر ذالک فلا یلومن الا نفسہ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے میرے بندو، اگر اوّل سے آخر تک تم سب اِنس اور جن اپنے سب سے زیادہ متقی شخص کے دل جیسے ہو جاؤ تو اس سے میری بادشاہی میں کوئی اضافہ نہ ہو جائیگا۔ اے میرے بندو! اگر اول سے آخر تک تم سب انس اور جن اپنے سب سے زیادہ بدکار شخص کے دل جیسے ہو جاؤ تو میری بادشاہی میں اس سے کوئی کمی نہ ہو جائیگی۔ اے میرے بندو، یہ تمہارے اپنے اعمال ہی ہیں جن کا میں تمہارے حساب میں شمار کرتا ہوں، پھر ان کی پوری پوری جزا تمہیں دیتا ہوں۔ پس جسے کوئی بھلائی نصیب ہو اسے چاہیے کہ اللہ کا شکر ادا کرے۔ اور جسے کچھ اور نصیب ہو وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔

۵۰۔ بیچ میں یہ تفصیل چھوڑ دی گئی ہے کہ ملکہ کیسے بیت المقدس پہنچی اور کس طرح اس کا استقبال ہوا۔ اسے چھوڑ کر اب اس وقت کا حال بیان کیا جارہا ہے جب وہ حضرت سلیمان کی ملاقات کے لیے ان کے محل میں پہنچی۔

۵۱۔ ذو معنی فقرہ ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ وہ یکایک اپنے ملک سے اتنی دور اپنا تخت موجود پاکر یہ سمجھ جاتی ہے یا نہیں کہ یہ اسی کا تخت اٹھا لایا گیا ہے۔ اور یہ مطلب بھی ہے کہ وہ اس حیرت انگیز معجزے کو دیکھ کر ہدایت پاتی ہے یا اپنی گمراہی پر قائم رہتی ہے۔

اس سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان اس تخت پر قبضہ کرنے کی

اور ہم نے سر اطاعت جھکا دیا تھا۔ (یا ہم مسلم ہو چکے تھے)[۵۳] اُس کو (ایمان لانے سے) جس چیز نے روک رکھا تھا وہ اُن معبودوں کی عبادت تھی جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتی تھی کیونکہ وہ ایک کافر قوم سے تھی[۵۴]

نیت رکھتے تھے۔ یہاں وہ خود اس مقصد کا اظہار فرما رہے ہیں کہ انہوں نے یہ کام ملکہ کی ہدایت کے لیے کیا تھا۔

۵۲ اس سے ان لوگوں کے خیالات کی بھی تردید ہو جاتی ہے جنہوں نے صورتِ واقعہ کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے کہ گویا حضرت سلیمان اپنی مہمان ملکہ کے لیے ایک تخت بنوانا چاہتے تھے، اس غرض کے لیے انہوں نے ٹینڈر طلب کیے، ایک ہٹے کٹے کاریگر نے کچھ زیادہ مدت میں تخت بنا دینے کی پیش کش کی، مگر ایک دوسرے ماہر اُستاد نے کہا میں ژٹ پھرٹ بنائے دیتا ہوں۔ اس سارے نقشے کا تار و پود اس بات سے بکھر جاتا ہے کہ حضرت سلیمان نے خود ملکہ ہی کا تخت لانے کے لیے فرمایا تھا (اَیُّکُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِھَا)، اور اس کی آمد پر اپنے ملازموں کو اسی کا تخت انجان طریقے سے اس کے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا تھا (نَکِّرُوْا لَھَا عَرْشَھَا)، پھر جب وہ آئی تو اس سے پوچھا گیا کہ کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے (اَھٰکَذَا عَرْشُکِ)، اور اس نے کہا گویا یہ وہی ہے (کَاَنَّہٗ ھُوَ)۔ اس صاف بیان کی موجودگی میں ان لاطائل تاویلات کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ اس پر بھی کسی کو شک رہے تو بعد کا فقرہ اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔

۵۳ یعنی یہ معجزہ دیکھنے سے پہلے ہی سلیمان علیہ السلام کے جو اوصاف اور حالات ہمیں معلوم ہو چکے تھے ان کی بنا پر ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ اللہ کے نبی ہیں، محض ایک سلطنت کے فرمانروا نہیں ہیں۔ تخت کو دیکھنے اور "گویا یہ وہی ہے" کہنے کے بعد اس فقرے کا اضافہ کرنے میں آخر کیا معنویت باقی رہ جاتی ہے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ حضرت سلیمان نے اس کے لیے ایک تخت بنوا کر رکھ دیا تھا؟ بالفرض اگر وہ تخت ملکہ کے تخت سے مشابہ ہی تیار کرا لیا گیا ہو تب بھی اس میں آخر وہ کیا کمال ہو سکتا تھا کہ ایک آفتاب پرست ملکہ اسے دیکھ کر یہ بول اٹھتی کہ "اُوْتِیْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِھَا وَکُنَّا مُسْلِمِیْنَ، ہم کو پہلے ہی علم نصیب ہو گیا تھا اور ہم مسلم ہو چکے تھے"۔

۵۴ یہ فقرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی پوزیشن واضح کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے یعنی اس میں ضد اور ہٹ دھرمی نہ تھی۔ وہ اس وقت تک صرف اس لیے کافر تھی کہ کافر قوم میں پیدا ہوئی تھی، ہوش

اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو۔ اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اُترنے کے لیے اس نے اپنے پائینچے اٹھا لیے۔ سلیمان نے کہا یہ شیشے کا چکنا فرش ہے[۵۵]۔ اس پر وہ پکار اٹھی "اے میرے رب میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی اور اب میں سلیمان کے ساتھ اللہ رب العٰلمین کی اطاعت قبول کرتی ہوں"[۵۶] ع ۳ع

سنبھلنے کے بعد سے اس کو جس چیز کے آگے سجدہ ریز ہونے کی عادت پڑی ہوئی تھی، بس وہی اس کے راستے میں ایک رکاوٹ بن گئی تھی۔ حضرت سلیمان سے سابقہ پیش آنے پر جب اس کی آنکھیں کھلیں تو اس رکاوٹ کے ہٹ جانے میں ذرا سی دیر بھی نہ لگی۔

۵۵ یہ آخری چیز تھی جس نے ملکہ کی آنکھیں کھول دیں۔ پہلی چیز حضرت سلیمان کا وہ خط تھا جو عام بادشاہوں کے طریقے سے ہٹ کر اللہ رحمان و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا تھا۔ دوسری چیز اس کے بیش قیمت ہدیوں کو رد کرنا تھا جس سے ملکہ کو اندازہ ہوا کہ یہ بادشاہ کسی اور طرز کا ہے۔ تیسری چیز ملکہ کی سفارت کا بیان تھا جس سے اس کو حضرت سلیمان کی متقیانہ زندگی، ان کی حکمت اور ان کی دعوتِ حق کا علم ہوا۔ اسی چیز نے اسے آمادہ کیا کہ خود چل کر ان سے ملاقات کرے، اور اسی کی طرف اس نے اپنے اس قول میں اشارہ کیا کہ "ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم مسلم ہو چکے تھے"۔ چوتھی چیز اس عظیم الشان تخت کا آنا فانا مارب سے بیت المقدس پہنچ جانا تھا جس سے ملکہ کو معلوم ہوا کہ اس شخص کی پشت پر اللہ تعالیٰ کی طاقت ہے۔ اور اب آخری چیز یہ تھی کہ اس نے دیکھا جو شخص یہ سامانِ عیش و تنعم رکھتا ہے اور ایسے شاندار محل میں رہتا ہے وہ کس قدر غرورِ نفس سے پاک ہے، کتنا خدا ترس اور نیک نفس ہے، کس طرح بات بات پر اس کا سر خدا کے آگے شکر گزاری میں جھکا جاتا ہے، اور اس کی زندگی فریفتگانِ حیاتِ دنیا کی زندگی سے کتنی مختلف ہے۔ یہی چیز تھی جس نے اسے وہ کچھ پکار اٹھنے پر مجبور کر دیا جو آگے اس کی زبان سے نقل کی گئی ہے۔

۵۶ حضرت سلیمان اور ملکۂ سبا کا یہ قصہ بائیبل کے عہدِ عتیق و جدید اور روایاتِ یہود سب میں مختلف طریقوں سے آیا ہے، مگر قرآن کا بیان ان سب سے مختلف ہے۔ عہدِ عتیق میں اس قصے

کا خلاصہ یہ ہے :

"اور جب سبا کی ملکہ نے خداوند کے نام کی بابت سلیمان کی شہرت سنی تو وہ آئی تاکہ مشکل سوالوں سے اُسے آزمائے۔ اور وہ بہت بڑی جلو کے ساتھ یروشلم میں آئی۔۔ جب وہ سلیمان کے پاس پہنچی تو اس نے ان سب باتوں کے بارہ میں جو اس کے دل میں تھیں اس سے گفتگو کی سلیمان نے ان سب کا جواب دیا۔۔۔ اور جب سبا کی ملکہ نے سلیمان کی ساری حکمت اور اس محل کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دسترخوان کی نعمتوں اور اس کے ملازموں کی نشست اور اس کے خادموں کی حاضر باشی اور ان کی پوشاک اور اس کے ساقیوں اور اس سیڑھی کو جس سے وہ خداوند کے گھر کو جاتا تھا۔ دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ سچی خبر تھی جو میں نے تیرے کاموں اور تیری حکمت کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی۔ تو بھی میں نے وہ باتیں باور نہ کیں جب تک خود آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیا۔ اور مجھے تو آدھا بھی نہیں بتایا گیا تھا کیونکہ تیری حکمت اور اقبال مندی اس شہرت سے جو میں نے سنی بہت زیادہ ہے۔ خوش نصیب ہیں تیرے لوگ اور خوش نصیب ہیں تیرے یہ ملازم جو برابر تیرے حضور کھڑے رہتے اور تیری حکمت سنتے ہیں۔ خداوند تیرا خدا مبارک ہو جو تجھ سے ایسا خوشنود ہوا کہ تجھے اسرائیل کے تخت پر بٹھایا۔۔۔ اور اس نے بادشاہ کو ایک سو بیس قنطار سونا اور مسالے کا بہت بڑا انبار اور بیش بہا جواہر دیئے اور جیسے مسالے سبا کی ملکہ نے سلیمان بادشاہ کو دیئے ویسے پھر کبھی ایسی بہتات کے ساتھ نہ آئے۔۔۔ اور سلیمان بادشاہ نے سبا کی ملکہ کو سب کچھ جس کی وہ مشتاق ہوئی اور جو کچھ اس نے مانگا دیا۔۔۔ پھر وہ اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو لوٹ گئی" (۱۔ سلاطین ۱۰ : ۱-۱۳۔ اسی سے ملتا جلتا مضمون ۲۔ تواریخ ۹ : ۱-۱۲ میں بھی ہے)۔

عہدِ جدید میں حضرت عیسٰی کی ایک تقریر کا صرف یہ فقرہ ملکۂ سبا کے متعلق منقول ہوا ہے :

"دکھن کی ملکہ عدالت کے دن اس زمانہ کے لوگوں کے ساتھ اٹھ کر ان کو مجرم ٹھیرائیگی، کیونکہ وہ دنیا کے کنارے سے سلیمان کی حکمت سننے کو آئی اور دیکھو یہاں وہ ہے جو سلیمان سے

بھی بڑا ہے۔" (متی ۱۲: ۴۲۔ لوقا ۱۱: ۳۱)

یہودی ربیوں کی روایات میں حضرت سلیمان اور ملکۂ سبا کا قصہ اپنی بیشتر تفصیلات میں قرآن سے ملتا جلتا ہے۔ ہُدہُد کا غائب ہونا، پھر آکر سبا اور اس کی ملکہ کے حالات بیان کرنا، حضرت سلیمان کا اس کے ذریعہ سے خط بھیجنا، ہُدہُد کا عین اس وقت وہ خط ملکہ کے آگے گرانا جبکہ وہ آفتاب کی پرستش کو جارہی تھی، ملکہ کا اس خط کو دیکھ کر اپنے وزراء کی کونسل منعقد کرنا، پھر ملکہ کا ایک قیمتی ہدیہ حضرت سلیمان کے پاس بھیجنا، خود یروشلم پہنچ کر ان سے ملنا، ان کے محل میں پہنچ کر یہ خیال کرنا کہ حضرت سلیمان پانی کے حوض میں بیٹھے ہیں، اور اس میں اترنے کے لیے پائینچے چڑھا لینا، یہ سب ان روایات میں اسی طرح مذکور ہے جس طرح قرآن میں بیان ہوا ہے۔ مگر ہدیہ وصول ہونے پر حضرت سلیمان کا جواب، ملکہ کے تخت کو اٹھوا منگانا، ہر موقع پر ان کا خدا کے آگے جھکنا، اور آخر کار ملکہ کا ان کے ہاتھ پر ایمان لانا، یہ سب باتیں، بلکہ خدا پرستی اور توحید کی ساری باتیں ہی ان روایات میں ناپید ہیں۔ سب سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ ان ظالموں نے حضرت سلیمان پر الزام لگایا ہے کہ انھوں نے ملکۂ سبا کے ساتھ معاذ اللہ زنا کا ارتکاب کیا اور اسی حرامی نسل سے بابل کا بادشاہ بخت نصر پیدا ہوا جس نے بیت المقدس کو تباہ کیا (جیوش انسائیکلو پیڈیا ج ۱۱ صفحہ ۴۴۳)۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ یہودی علماء کا ایک گروہ حضرت سلیمانؑ کا سخت مخالف رہا ہے۔ ان لوگوں نے ان پر توراۃ کے احکام کی خلاف ورزی، غرورِ حکومت، غرورِ عقل و دانش، زن مریدی، عیش پرستی اور شرک و بت پرستی کے گھناؤنے الزامات لگائے ہیں (جیوش انسائیکلو پیڈیا ج ۱۱ س ۴۳۹-۴۴۱)۔ اور یہ اسی پروپیگنڈے کا اثر ہے کہ بائیبل انہیں نبی کے بجائے محض ایک بادشاہ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور بادشاہ بھی ایسا جو معاذ اللہ احکام الٰہی کے خلاف مشرک عورتوں کے عشق میں گم ہوگیا، جس کا دل خدا سے پھر گیا اور جو خدا کے سوا دوسرے معبودوں کی طرف مائل ہوگیا (۱۔ سلاطین ۱۱: ۱-۱۱)۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن نے بنی اسرائیل پر کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے اکابر کا دامن خود اُن کی پھینکی ہوئی گندگیوں سے صاف کیا، اور یہ بنی اسرائیل کتنے احسان فراموش ہیں کہ اس پر بھی یہ قرآن اور اس کے لانے والے کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔

مذہب کی آڑ میں استعماریت[1]

(عبدالحمید صدیقی)

جب کوئی سطح بین آنکھ عیسائی مبلغین کے کارناموں کو دیکھتی ہے تو یہی سمجھتی ہے کہ خدا ترس اور پاکباز انسانوں کا ایک گروہ ہے جو اپنے خالق اور مالک کی رضا جوئی کے لیے مذہب کی اشاعت کر رہا ہے۔ اس کے ارادے بڑے نیک اور اس کی آرزوئیں اور تمنائیں بڑی ہی پاکیزہ ہیں۔ ہمیں خواہ ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف ہو اور اُن کے دین کو بھی ہم صحیح نہ سمجھتے ہوں لیکن ان کے اخلاص کے بارے میں عام طور پر لوگوں کو کوئی شبہ نہیں گزرتا بلکہ اُن کی مذہب سے وابستگی و شیفتگی اور اس کی توسیع و اشاعت کے لیے ہر قسم کا ایثار لوگوں سے خراجِ تحسین حاصل کرتا ہے۔

پھر اس معاملہ میں بھی عام انسان غلط فہمی کا شکار ہیں کہ یہ لوگ اگرچہ عیسائیت کے مبلغ اور داعی ہیں مگر ان کا نقطۂ نظر محدود نہیں۔ اُن میں دوسرے مذاہب کے مبلغین کی طرح تنگ نظری و تعصب ناپید ہے۔ یہ پوری نوعِ بشری کے خادم ہیں۔ ان کے نزدیک مشرقی اور مغربی، گورے اور کالے، ایشیائی یا افریقی کی کوئی قید نہیں۔ اُن کی محبت ہر ذی روح کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے تیار رہتی ہے۔ جب کوئی دکھی انہیں پکارتا ہے تو یہ فوراً اُس کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ جب کوئی ضرورت مند اور محتاج ان کی طرف رجوع کرتا ہے تو یہ فوراً اس کی دادرسی کے لیے اُس کی طرف لپکتے ہیں۔ الغرض یہ انسانیت کے بے مزد غلام ہیں۔ کوئی دنیاوی غرض اور کوئی نفسانی خواہش ان کے اعمال کا محرک نہیں ہوتی بلکہ اُن کے پیچھے صرف ایک ہی جذبہ کام کرتا ہے کہ وہ انسانیت کے دکھوں کا مداوا کریں اور اس طرح اپنے خالق و مالک اور اُس کے پیارے "بیٹے" کی خوشنودی حاصل کریں۔ اسی غرض کے لیے انہوں نے

[1] یہ مضمون ڈاکٹر مصطفیٰ خالدی اور ڈاکٹر عمر فروخ کی مشہور عربی تصنیف "التبشیر والاستعمار" MISSIONARIES AND IMPERIALISM سے ماخوذ ہے۔

جگہ جگہ سکول، کالج، ہسپتال، یتیم خانے اور محتاجوں کے مراکز قائم کر رکھے ہیں اور اُن پر کروڑوں نہیں بلکہ اربوں اور کھربوں روپے سالانہ صرف ہوتے ہیں۔ ان سکولوں اور کالجوں سے، ان شفاخانوں اور یتیم خانوں سے عیسائیوں کے مقابلے میں غیر عیسائی بہت زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

عیسائی مشنریوں کی یہ کارگزاریاں بظاہر نہایت مفید اور قابل قدر ہیں اور اس وجہ سے پوری نوع انسانی ان کی احسانمند اور شکر گزار ہے۔ لاتعداد مریضوں کو ان کے شفاخانوں کے ذریعہ شفا حاصل ہوئی ہے، اَن گنت بچوں کو ان کی درسگاہوں نے جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی میں آباد کیا ہے۔ ان کے محتاج خانوں نے بیشمار لاوارث بچوں اور بے سہارا لوگوں کو پناہ دی ہے۔ اس کے علاوہ ان مبلغین میں انسان سیرت و کردار، بے نفسی اور بے غرضی، مستعدی اور حوصلہ مندی، جرأت و ایثار کے بعض بہت اچھے نمونے بھی دیکھ سکتا ہے مگر یہ تصویر کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو بڑا ہی دردانگیز اور انسانیت سوز ہے۔

اسی مذہبی تبلیغ اور انسانی اخوت و محبت کی آڑ میں مغربی استعمار کو دنیا کے مختلف ممالک میں اثر و نفوذ کا موقع فراہم ہوا۔ استعماریت نے جس ملک یا علاقہ کو اپنے ناپاک عزائم کی آماجگاہ بنانا چاہا وہاں سب سے پہلے عیسائی مشن ہی مقدمۃ الجیش کی صورت میں داخل ہوئے اور انہوں نے آہستہ آہستہ بڑے سلجھے بندھے پروگرام کے تحت استعماری عساکر کے لیے راستہ ہموار کیا۔ یہ مبشرین بظاہر تو مسیحیت کی نشر و اشاعت اور خدمتِ خلق کے دوسرے کاموں میں مصروف نظر آئے مگر انہوں نے پس پردہ جاسوسی کے فرائض سرانجام دیئے۔ عیسائیوں کے یہ مشن مشرقی ممالک میں مغربی استعمار کے سب سے بڑے ایجنٹ ہیں اور استعماری عزائم کی تکمیل میں انہیں ہمیشہ ایک نہایت عمدہ آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

اب جبکہ مغربی دنیا حالات کے ہاتھوں اس بات پر مجبور ہوگئی ہے کہ وہ مشرقی ممالک کو سیاسی طور پر آزاد کر دے تو اس وقت یہ عیسائی مشنری مختلف ممالک میں اپنی اپنی قوموں کے استعماری مفادات کی پوری قوت کے ساتھ حفاظت اور پاسبانی کر رہے ہیں۔ ان کے مراکز وہ

کمین گاہیں ہیں جن میں استعماریت کا دیو استبداد بڑی آسانی کے ساتھ چھپ کر بیٹھ سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب امپیریلزم سیاسی اقتدار کی صورت میں مشرق پر اپنا تسلط قائم نہیں رکھتا بلکہ دعوتِ دین اور خدمتِ انسانیت کے نام پر غارتگری کرتا ہے۔

سطورِ بالا میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ کوئی ایسی ڈھکی چھپی بات نہیں جس سے لوگ یکسر بے خبر ہوں۔ وہ حضرات جنھوں نے سطح سے نیچے اتر کر ان مسیحی مبلغین کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں۔ اس موضوع پر متعدد کتب، رسالے اور پمفلٹ بھی شائع ہوئے ہیں۔ اس نیم براعظم میں پروفیسر باسو نے اس مسئلہ پر ایک نہایت ہی قابل قدر کتاب "ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کا عروج" کے نام سے مرتب کی۔ اسی نوع کی ایک نہایت عمدہ کوشش اب حال ہی میں عربی دنیا کے دو نامور اصحابِ علم نے "التبشیر والاستعمار فی البلاد العربیۃ" میں کی ہے۔ ان حضرات میں ایک ڈاکٹر مصطفیٰ خالدی ہیں جو پہلے بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں نائب پروفیسر تھے اور اب نیشنل سکول آف نرسنگ کے پرنسپل ہیں۔ دوسرے صاحب ڈاکٹر عمر فروخ دمشق میں عرب اکادمی کے رکن ہیں۔ یہ دونوں اصحاب نہ صرف جدید تعلیم یافتہ ہیں بلکہ ان کا ان عیسائی مشنریوں کے ساتھ سالہا سال براہ راست تعلق بھی رہا ہے۔ اس بنا پر ان کے مشاہدات اور تاثرات کو کسی متعصب مذہبی دیوانے کے اوہام سمجھ کر رد نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے اس کتاب میں اپنے نقطۂ نظر کو پورے دلائل و شواہد کے ساتھ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اشاعتِ دین کا یہ کام سراسر ڈھونگ ہے۔ اگر مذہب کی محبت ہی ان لوگوں کی جدوجہد کا محرک ہوتی تو پھر مشنریز کے ان گروہوں میں وہ لوگ کبھی شامل نہ ہوتے جو مذہب کی بنیادی تعلیمات تک کے بھی منکر ہیں۔

اس معاملہ کا دلچسپ پہلو یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ان مبلغین میں بعض وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو یا تو اپنی حکومتوں کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر ملک چھوڑ دیتے ہیں یا حکومتِ وقت ان لوگوں کی تخریبی کارروائیوں سے مجبور ہو کر انہیں ملک بدر کر دیتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو نہ تو اپنے ملک سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے اور نہ ہی ان حکومتوں کو ان کی سرگرمیوں سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے

مگر یہ عجیب بات ہے کہ جو بھی "مغضوبین" کا یہ گروہ "خدمت دین" کے کام پر مشرق کی طرف نکلتا ہے تو ان کی ساری تخریبی سرگرمیوں کے باوجود اُن پر اپنے اپنے ممالک کی طرف سے لطف و کرم کی بارش ہونے لگتی ہے اور ان "باغیوں" کی ہر ممکن طریق سے پشت پناہی کی جاتی ہے۔

پھر بعض ممالک ایسے بھی ہیں جو دین کے سخت دشمن ہیں اور مذہب کی بیخ کنی کو ہی اپنے وجود کا واحد مقصد خیال کرتے ہیں مگر غیر ممالک میں تبلیغی سرگرمیوں کو وہ بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی کہ مذہب نواز ممالک۔ یہ ایک عجیب تضاد ہے کہ جو قومیں اپنے اندر مذہب کے وجود کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کرسکتیں اور اسے ہر طرح سے مٹانے کے درپے رہتی ہیں وہ ملک کی چار دیواری کے باہر دین کی سب سے بڑی حامی اور ناصر بن جاتی ہیں۔ چنانچہ دیکھیے کہ روس جیسے مذہب کُش ملک نے دوسری جنگِ عظیم کے بعد اپنے اثر و نفوذ کو دوسرے ممالک میں بڑھانے کے لیے ماسکو میں ایک مذہبی کانفرنس منعقد کی جس کو خود اسٹالن نے شرکت کا اعزاز بخشا۔ اس موقع پر یہ طے کیا گیا کہ اقطاعِ عالم میں اور خصوصاً دنیائے اسلام میں روس کو اپنی تبلیغی سرگرمیاں منظم طریق پر شروع کرنی چاہییں۔

اسی طرح جنرل ہیگ نے بھی حکومت برطانیہ کو اس بات کا مشورہ دیا کہ وہ جزیرۃ العرب میں مسیحیت کی نشر و اشاعت کے لیے کوئی اعلیٰ پروگرام بنائے۔ اس پروگرام کے طے ہو جانے کے بعد مختلف قسم کے لوگ مختلف عزائم اور مقاصد کے ساتھ اس کام کے لیے اپنے گھروں سے نکل پڑے۔ بعض محض سیر و سیاحت کے خواہشمند تھے، بعض ان مہمات کو اپنے ذاتی افکار و نظریات دوسروں تک پہنچانے کا مؤثر ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان میں کافی تعداد ان لوگوں پر مشتمل تھی جو اپنے ملک میں نہایت ہی ناکام اور نامراد تھے اور اس وجہ سے انھوں نے دوسرے ممالک کا رُخ کیا۔ ان حضرات کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ باور نہیں کرسکتا کہ ان کے پیش نظر اشاعتِ دین ہے۔ ان میں بسا اوقات ایسے لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو شرافت و اخلاق سے قطعاً عاری ہیں اور اپنی کمینہ حرکات کی وجہ سے اُن کا وجود مذہب کے لیے مفید ہونے کے بجائے انتہائی مضرت رساں ثابت ہوتا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف مخلص نصاریٰ نے ایک رسالہ "العصبیۃ الاندلسیۃ" میں بڑے واشگاف الفاظ میں کیا ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ پروٹسٹنٹ دینی

نقطۂ نظر سے انسانیت کو بہت نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ان حضرات کا دوسرے ممالک میں اقامت پذیر ہونا مذہب کے لیے نہایت مہلک ہے۔ ایک ایسا شخص جو اخلاقی اعتبار سے انتہائی پست ہے وہ اگر ماہر تعلیم ہو یا اپنے علم و فضل کی بنا پر ایک تاریخی شخصیت بھی بن جائے مذہبی نقطۂ نظر سے وہ کسی طرح مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا۔ اخلاق مذہب کی جان ہے، مذہب اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک لوگ اخلاقی لحاظ سے بلند ہوں گے۔ اخلاق کا زیاں مذہب کی موت ہے۔ اس لیے اشاعت دین کا کوئی ادارہ اخلاق سے عاری لوگوں کو کبھی بھی اپنانے پر تیار نہیں ہوتا۔ مگر ان عیسائی مشنریوں کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ مبشرین کے یہ ادارے اپنے نمائندوں کے عیوب اور خامیوں کو جانتے بوجھتے بھی ان کی مدح و ستائش کرتے چلے جاتے ہیں۔ دنیا کے مختلف رسائل و جرائد اور اخبارات میں اُن کی تعریف و توصیف ہوتی ہے اور ان کی تصاویر شائع کی جاتی ہیں اور ہر ممکن طریق سے لوگوں کے ذہنوں میں اس باطل خیال کی آبیاری کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کے فضائل سے نہ صرف آشنا ہیں بلکہ وہ اُن کے عملی نمونے بھی ہیں۔ ان لوگوں کی اصول پسندی کا یہ عالم ہے کہ جب تک اُن کے مفادات کیتھولک گروپ سے وابستہ رہتے ہیں تو یہ اس کے پُر جوش مبلغ ہوتے ہیں اور جب یہ مفادات دوسری طرف نظر آتے ہیں تو فوراً پروٹسٹنٹ کی طرف لپک جاتے ہیں۔ پادری جیسپ اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

"عیسائی مشنری اب اخلاقی اعتبار سے اس حد تک گر گئے ہیں کہ ان کے واقعات بیان کرتے ہوئے سخت ندامت محسوس ہوتی ہے۔ چند دنوں کی بات ہے کہ روم کے ایک ممتاز گھرانے کی دو لڑکیاں ان لوگوں نے اغوا کر لیں۔ سراغ لگانے والوں نے پتہ کر کے متعلقین کو خبر کر دی۔ انہوں نے ان کی اس مذموم حرکت پر بڑی لعن طعن کی۔"

مصنف مذکور اسی قسم کے اور بہت سے گھناؤنے الزام عائد کرنے کے بعد لکھتا ہے:

"یہ کلیسائی نظام ایک لعنت ہے جس کی وابستگی انسانوں کو مفاد پرست اور ہوا و ہوس کا غلام بنا دیتی ہے۔ بعض گرجے تو فواحش اور بدکاری کے مخفی اڈے ہیں۔"

ان سب خامیوں اور خرابیوں کے باوجود جس بات میں تمام عیسائی ممالک ایک دوسرے کے ہم نوا ہیں وہ عرب اور اسلام دشمنی ہے۔ یہ دشمنی دلوں میں اس قدر راسخ ہو چکی ہے کہ اسے آسانی سے نکالا نہیں جا سکتا۔ یہ ایک تاریخی عناد ہے جس کی جڑیں بہت گہری ہیں صلیبی جنگوں نے اس دشمنی میں مزید شدت پیدا کر دی ہے۔ اس وقت سے مسلمان اور عیسائی ایک دوسرے سے برسر پیکار ہیں۔

بعض انجان ابھی تک یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان عداوت کی اصل وجہ صرف مذہبی اختلافات ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اختلافات بھی ان دو قوموں کے درمیان بنائے نزاع ہیں جنہیں کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ان نظریاتی اختلافات کے علاوہ ان دونوں اقوام کی باہمی آویزش کا اصلی سبب مسلمانوں کی سیاسی طاقت و اقتدار ہے۔ جرمن مستشرق کارل بیکر اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے:

"قرونِ وسطیٰ میں جب اسلام کی نشر و اشاعت شروع ہوئی تو یہ چیز نصرانیت کے لیے سخت باعثِ تکلیف ثابت ہوئی۔ عیسائیوں کو دینی اور اقتصادی لحاظ سے بہت نقصان پہنچا۔ اسلام کے اثرات مفتوحہ علاقوں سے نکل کر دور دور تک پھیلنے لگے۔ یہ صورتِ حال مسیحیت کے پرستاروں کے لیے موجبِ اذیت تھی۔ یہیں سے مسلمانوں کے خلاف نفرت و دشمنی کے داغ بیل پڑی جو بعد میں مختلف حالات کے تحت پھولتی پھلتی رہی۔"

قریب قریب اسی خیال کا اظہار ایک اور مستشرق گارڈ فرنے بھی کیا ہے۔ یورپ اسلام کے اس غلبہ اور ترقی کو ٹھنڈے پیٹوں کیونکر قبول کر سکتا تھا۔ اس لیے یورپ کی مختلف سلطنتوں نے ایک منظم طریق سے اسلام کو شکست دینے کے منصوبے تیار کیے۔ جہاں فوجی اور جیاری سے کام نکلتا ہوا دکھائی دیا وہاں مسلمانوں پر جبر و استبداد کے پہاڑ توڑے گئے اور جہاں عیاریوں اور چالبازیوں سے مسلمانوں کو زک دینا ممکن ہوا وہاں ان طریقوں کو بلا تکلف استعمال کیا گیا اور جس جگہ یہ صورت ممکن نہ تھی وہاں مبشرین کے گروہ بھیج دیئے گئے تاکہ وہاں مذہب اور دین کے نام پر ان لوگوں کو مسخر کیا جائے۔ ان مبلغین نے اپنے ان ناپاک مقاصد کے حصول کے لیے بڑی حکمت و دانائی سے کام لیا۔ مسلمانوں کے اندر فروعی اختلافات کو ابھارا تاکہ ان کی ملت

کا شیرازہ منتشر ہو۔ مشہور مستشرق لارنس براؤن اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"مسلمانوں کا اتحاد دنیا کے لیے خطرہ کی گھنٹی ہے اگر یہ منتشر رہیں تو بے وزن ہوں گے اور ہمارے لیے مفید بھی بن سکیں گے۔"

اسی طرح سائمن نے اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے اس بات کو ذرا کھل کر ان الفاظ میں یوں بیان کیا ہے

"وحدت اسلامی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے مسلمانوں کی تمام امیدیں بر آسکتی ہیں مگر یہ چیز یورپین غلبہ و اقتدار کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے جسے دُور کرنے کی انہیں ہر وقت فکر کرنی چاہیے۔"

عیسائی مبشرین بظاہر وحدت اسلامی کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ اس کی تائید و حمایت کے لیے کبھی کبھی طویل مقالات بھی شائع کرتے رہتے ہیں لیکن ان کی برابر یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو بے دین بنایا جاسکے۔ یہ حضرات اس امر سے پوری طرح واقف ہیں کہ مسلمانوں کے اندر قوت رابطہ صرف اسلام ہے۔ اس کی مقناطیسی کشش ہی انہیں ایک دوسرے سے جوڑ سکتی ہے اور اگر یہ درمیان سے ہٹ جائے تو پھر مسلمانوں کو کوئی چیز باہم مربوط نہیں کر سکتی۔ ان لوگوں کو اصل خطرہ مسلمانوں کی وحدت سے نہیں بلکہ اسلام سے ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ "انسانیت کے ان خادموں" نے مسلمانوں کی مذہبی تحریکات کو کچلنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔

یورپ کے مرد بیمار یعنی ترکی سے مغربی استعمار کو آخر کیا خطرہ ہو سکتا تھا لیکن جب یہاں دینی بنیاد پر وحدت قومی کا نعرہ بلند ہوا اور سنوسی مذہبی گروہ نے سر اٹھایا اور اس بے سرو سامانی کے باوجود مغربی استعمار کی بڑھتی ہوئی یلغار کو روکنے کی کوشش کی تو اس وقت تمام عیسائی ممالک میں ایک کھلبلی مچ گئی اور یہ بیمار ترکی ان کے لیے ایک عظیم خطرہ بن گیا۔ یہ خطرہ کچھ اس وجہ سے نہ تھا کہ ترکی ایک مسلمان ملک ہے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ترکی اسلام کی بنیاد پر ایک وحدت بن کر ابھر رہا تھا اور اس نے دنیا کے مسلمانوں کی ہمدردیاں بھی حاصل کر لی تھیں۔

اسی طرح چین میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اتحاد کو دیکھ کر چالاک عیسائیوں نے دشمنی کا

ہاتھ بڑھایا تو سموئیل مبلغ نے ان نصرانیوں کو جنہوں نے یہ حرکت کی تھی بزدل قرار دیتے ہوئے انہیں اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ حالانکہ یہ دوستی حقیقی دوستی نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ کوئی عیسائی بھی صلیبی جنگوں کی تلخیاں فراموش نہیں کر سکتا۔ بلکہ مختلف تدابیر سے ان تلخیوں کو ذہن میں محفوظ رکھنے کی پوری پوری کوشش کی جاتی ہے۔ پوپ شانتو رمشن کالج بیروت کے پرنسپل نے اپنی حکومت کو اس سلسلہ میں یہ مشورہ دیا ہے کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں بلند پایہ مبلغین تیار کر کے دنیا کے مختلف گوشوں میں بھیجے جائیں جہاں وہ صلیبی جنگوں کی یاد کو ذہنی طور پر تازہ رکھنے کی سعی کریں اور اس سے پیدا شدہ جذبات کو اپنے کام میں لائیں۔ پوپ شانتو را ایک نامور مذہبی شخصیت ہے۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ عیسائی سیاست کا آئینہ دار ہے۔ کوئی حکمران اس کی مرضی کے بغیر تختِ اقتدار پر متمکن نہیں رہ سکتا۔ استعماری طاقتیں ان کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ اُن کی عظمت کے مطابق ان کے مشورہ کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان بیانات اور واقعات کو پڑھنے کے بعد کسی کو اس بات میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ان مبلغین کے پیشِ نظر صرف سیاسی قوت و اقتدار ہے۔ مذہبی تبلیغ تو محض ایک فریب ہے جس کی آڑ میں مشرقی اقوام کا شکار کیا جا رہا ہے۔

مبلغین کی افترا پردازیاں ان مبشرین نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو منصوبہ تیار کیا ہے اس کا دوسرا جزو تعلیماتِ الٰہی اور حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مختلف قسم کی گمراہیاں پھیلانا اور الزامات تراشنا ہے۔ ان لوگوں کی ذہنی کجی کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ یورپ میں ایک دفعہ میری چند ماہرینِ مذہب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ مذہبی مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا جائے۔ میں نے ان کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے ان کی اس تجویز کو منظور کر لیا۔ وہ دوسرے دن وقتِ مقررہ پر تشریف لائے اور گفتگو کا آغاز کسی دینی مسئلہ کی بجائے ایک اسلامی رسالہ کے مصنف سے کیا اور اس پر مختلف قسم کے اعتراضات کر کے بحث شروع کر دی۔ مجھے ان کا یہ طریقہ ناگوار گزرا اور ان سے کہا کہ جب آپ دینی مسائل پر گفتگو کے لیے تشریف لائے ہیں تو کسی اہم مسئلہ کو سامنے رکھ کر اس پر تبادلۂ خیالات کیجیے۔ اگر آپ کو مسئلہ کے تعین میں کوئی

وقت ہے تو میں متعین کیسے دیتا ہوں۔ رسالت محمدی کا مسئلہ خاصا اہم ہے اس پر بات چیت کر لی جائے۔ اس پر ایک شخص نے بڑے مغرورانہ انداز میں کہا: "آپ علمی آدمی معلوم ہوتے ہیں، ایسے مسئلہ پر گفتگو کریں جو علمی اور عقلی طور پر ثابت کیا جا سکے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کو مسلمان محض جذبات سے مغلوب ہو کر تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے آپ جیسے شخص کو ایسے مسئلہ پر اظہار خیال سے اجتناب کرنا چاہیے۔ یہ چیز آپ کے مرتبہ سے (معاذ اللہ) فروتر ہے۔ میں چونکہ جانتا تھا کہ منطقی دلائل ان کے لیے بالعموم مفید ثابت نہیں ہوتے اس لیے میں نے بات کاٹتے ہوئے صرف اتنا کہا: "ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اسی طرح ایمان لاتے ہیں جس طرح آپ لوگ حضرت عیسیٰ کو خدا تسلیم کرتے ہیں۔" اس پر وہ حیران سے ہو گئے اور بات ختم ہو گئی۔

یہ عیسائی مبلغین اسلام کے متعلق جو رائے رکھتے ہیں اس کی چند مثالیں بھی ملاحظہ ہوں:

مسلمانوں اور عربوں کا ایک بہت بڑا دشمن لیقونیان لکھتا ہے: "مسلمان ایک جاہل قوم ہے جو خدا کے بارے میں تنزیہ کا عقیدہ رکھتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو انسانی صفات جسم، ناک، ہاتھ وغیرہ سے مبرا قرار دیتی ہے۔" اسی طرح کی ایک مضحکہ خیز بات مشہور مبلغ نلسن نے کی ہے۔ اس کا بیان ہے: "اسلام بذات خود کچھ بھی نہیں۔ اس میں اگر کوئی خوبی ہے تو وہ نصرانیت سے ماخوذ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں جو کچھ ہے وہ بت پرستی ہے جسے ہو بہو یا تھوڑی سی ترمیم کے بعد اسلام میں شامل کر لیا گیا ہے۔" ایک اور بڑے مبلغ جان ٹاکل کا کہنا ہے: "اب ہمیں مسلمانوں کی کتاب مقدس (قرآن حکیم) کی مذمت کرنی چاہیے کیونکہ یہ اسلام کا سب سے زیادہ تیز اور موثر ہتھیار ہے۔ ہمیں لوگوں کو بتانا چاہیے کہ قرآن مجید میں جو باتیں صحیح ہیں وہ سب کی سب پرانی اور دوسرے مذاہب سے اخذ کردہ ہیں اور نئی باتیں ساری کی ساری غلط اور بے بنیاد ہیں۔" ایک اور مبلغ اپنی تحقیق کے لو اور اس طرح پیش کرتے ہیں: "اسلام کا دارومدار ایسی احادیث پر ہے جن کا ماخذ قرآن ہے لیکن جب ہم جھوٹی احادیث چھانٹ کر الگ کر دیں تو دین اسلام میں باقی کچھ نہیں رہتا۔ اس کی حیثیت تمرہندی (املی) کی سی ہے جس کا بیج اگر نکال دیا جائے تو وزن ختم ہو جاتا ہے۔"

ان اقتباسات کو جن کی حیثیت مشتے نمونہ از خروارے کی سی ہے ذرا مطالعہ فرمائیں اور دیکھیں کہ اسلام کے متعلق کس قسم کی گوہر افشانیاں کی جارہی ہیں۔ اب ایک نظر عقلیت کے ان دعویداروں کے چند قرآنی نکات پر بھی ڈال لیجیے۔ فریڈرک ملس قرآن مجید پر اعتراضات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "قرآن نے مریم والدہ عیسیٰ علیہ السلام اور مریم عمران کی بیٹی موسیٰ وہارون کی بہن کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: يَا أُخْتَ هَارُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا (اے ہارون کی بہن: نہ تیرا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی) قرآنِ کریم کی اس آیت پر ملس صاحب فرماتے ہیں: حضرت مریم اُمّ عیسیٰ (علیہ السلام) حضرت ہارونؑ کی بہن کس طرح ہوسکتی ہیں جبکہ اُن کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے چودہ سو برس پہلے کا ہے۔ ملس صاحب کا علم وفضل دیکھیے کہ وہ اس معمولی سی بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہاں قرآن ایک کنایہ سے کام لے رہا ہے۔ جس میں ام عیسیٰ مریم کو عفت اور پاکدامنی میں عمران کی بیٹی اختِ ہارون سے تشبیہ دی گئی ہے[1]۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ہم کسی شخص کی تعریف میں کہہ دیتے ہیں

---

[1] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اس مقام کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

ان الفاظ کے دو مفہوم ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ انہیں ظاہری معنی میں لیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ حضرت مریمؑ کا کوئی بھائی ہارون نامی ہو۔ دوسرے یہ کہ عربی محاورے کے مطابق اختِ ہارونؑ کے معنی "ہارون کے خاندان کی لڑکی" لیے جائیں۔ کیونکہ عربی میں یہ ایک معروف طرزِ بیان ہے۔ مثلاً قبیلۂ مضر کے آدمی کو یا اخا مضر (اے مضر کے بھائی) اور قبیلۂ ہمدان کے آدمی کو یا اخا ھمدان (اے ہمدان کے بھائی) کہہ کر پکارتے ہیں۔ پہلے معنی کے حق میں دلیلِ ترجیح یہ ہے کہ بعض روایات میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معنی منقول ہوئے ہیں اور دوسرے معنی کی تائید میں دلیل یہ ہے کہ موقع ومحل اس معنی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ اس واقعہ سے قوم میں ہیجان برپا ہوا تھا۔ اس کی وجہ بظاہر یہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہارون نامی ایک گمنام شخص کی کنواری بہن گود میں بچہ لیے ہوئے آئی تھی بلکہ جس چیز نے لوگوں کا ایک ہجوم حضرت مریمؑ کے گرد جمع کردیا

یا اخا العرب (اے عربی بھائی)۔ حالانکہ اس شخص سے ہمارا کوئی خون کا رشتہ نہیں ہوتا۔

اسی طرح کی قرآن دانی کا ایک دوسرا شاہکار بھی ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر اڈولف خیز مارد، جو فلسفہ کے ڈاکٹر ہیں، استفہام انکاری اور استفہام عادی میں کوئی تمیز نہیں کر سکتے۔ انہوں نے اس آیت اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے کہ وہ مومن ہو جائیں؟)[1]

(باقی ص۲۶ پر)

تھا یہی ہو سکتی تھی کہ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے، خانوادۂ ہارون کی لڑکی اس حالت میں پائی گئی۔ اگرچہ ایک حدیث مرفوع کی موجودگی میں کوئی دوسری تاویل قابلِ لحاظ نہیں ہو سکتی لیکن مسلم، نسائی، ترمذی وغیرہ میں یہ حدیث جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ان الفاظ کے معنی لازماً ہارون کی بہن ہی ہیں۔ مغیرہ بن شعبہ کی روایت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ نجران کے عیسائیوں نے حضرت مغیرہ کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا کہ قرآن میں حضرت مریم کو ہارون کی بہن کہا گیا ہے حالانکہ حضرت ہارون ان سے سینکڑوں برس پہلے گزر چکے تھے۔ حضرت مغیرہؓ ان کے اس اعتراض کا جواب نہ دے سکے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ ماجرا عرض کیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ تم نے یہ جواب کیوں نہ دے دیا کہ بنی اسرائیل اپنے نام انبیاء اور صلحاء کے نام پر رکھتے تھے۔ حضورؐ کے اس ارشاد سے صرف یہ بات نکلتی ہے کہ لاجواب ہونے کی بجائے یہ جواب دے کر اعتراض رفع کیا جا سکتا تھا۔ (ترجمان القرآن جلد ۲۹ عدد ۴)

[1] نامناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تشریح درج کر دیں:

"اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو زبردستی مومن بنانا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ آپ کو ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ دراصل اس فقرے میں وہی اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے جو قرآن میں بکثرت مقامات پر ہمیں ملتا ہے کہ خطاب تو بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے مگر اصل میں لوگوں کو وہ بات سنانی مقصود ہوتی ہے جو نبی کو خطاب کر کے فرمائی جاتی ہے۔ یہاں جو کچھ کہنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ لوگو! حجت اور دلیل سے ہدایت و ضلالت کا فرق کھول کر رکھ دینے اور راہِ راست صاف دکھا دینے کا جو حق تھا وہ تو ہمارے نبی نے پورا پورا ادا کر دیا ہے۔ اب اگر تم خود راست رو (باقی ص۶ پر)

محسنِ انسانیتؐ

(مخالفت کے طوفانوں سے گذرتے ہوئے)

اور اُجالا پھیلتا ہی گیا

(نعیم صدیقی)

(بسلسلۂ گذشتہ)

تنقید تحریک اسلامی کی دعوت و پیل کے ساتھ محض اپیل ہی نہیں لائی بلکہ اس نے اپیل کے ساتھ بھرپور تنقید سے بھی کام لیا۔ صوفیانہ مذاہب میں تو شاید دعوت کا ایک ہی اسلوب چل سکتا ہے یعنی منت و لجاجت اور خوشامد و التماس کا اسلوب۔ آخر جہاں محض افراد کی ذات اور ان کی محدود نجی زندگی تک ہی سے واسطہ ہو اور نظامِ اجتماعی کی اصلاح یا تعمیرِ نو کا کوئی سوال ہی سامنے نہ ہو وہاں اس اسلوب سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی ہے۔ صوفیانہ مسلکوں اور انفرادی دھرموں میں صرف یہ پیشِ نظر ہوتا ہے کہ زیرِ اثر افراد کو کچھ عقیدوں اور کچھ انفرادی خوبیوں سے آراستہ کر دیا جائے اور پھر ان کو برائی کی طاقت سے اپنا آپ بچاتے رہنے کا درس دیا جائے لیکن بدی کی اجتماعی طاقت سے لڑنے اور فاسد ماحول سے ٹکر لینے کا کوئی داعیہ موجود نہیں ہوتا۔ ظلم قیادت کی مسند پر بیٹھا اپنا ڈنکا بجاتا ہے اور انسانیت اس کے قدموں میں ذبح کی جاتی ہے، آخر ان دنیوی جھمیلوں سے ایک اللہ مست زاہد کو کیا مطلب! چنانچہ ایسے محدود روحانی نظاموں میں آدمی کی سب سے بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ دنیا کے معاملات اور سیاست کے جھمیلوں سے الگ تھلگ رہے، ہر کسی کے آگے یکساں انکسار اور لجاجت دکھائے، "یا مسلمان اللہ اللہ یا برہمن رام رام"۔

کا کیش اختیار کرے، تواضع ہر ایک کے سامنے کرے اور درشتی کسی سے بھی نہ برتے ایسے نظاموں میں جنہیں آدمی کو میدانِ کشمکش میں نہ اتارنا ہو بلکہ اسے تمدن کی جدوجہد سے نکال کر غاروں اور خانقاہوں میں جا بٹھانا ہو، تنقید سے کام لینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔کیونکہ تنقید تو ذہنی دنیا میں کشمکش کا آغاز ہوتی ہے۔ چنانچہ محدود روحانیت اور انفرادی مذہبیت کی نگاہوں میں یہ آدمی کی پستیٔ کردار شمار ہوتی ہے کہ وہ کسی طاقت کے خلاف زبانِ تنقید کھولے جیسے یہ دامنِ تقویٰ پر دھبے ڈالنے والا کوئی کام ہو اور اس کے کرنے سے روح کی شانتی ملدی جاتی ہو۔

لیکن جو نظریے اور دعوتیں تمدن میں انقلاب برپا کرنے اٹھیں ان کے اسلحہ خانہ فکر میں دلیل اور اپیل کی طرح تنقید بھی درجۂ اوّل کی اہمیت رکھتی ہے۔ یہاں صرف احقاقِ حق پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا بلکہ ابطالِ باطل بھی واجب ہوتا ہے۔ کیونکہ ابطالِ باطل کے بغیر احقاقِ حق بھی پوری طرح نہیں ہو پاتا یہاں خدا پر ایمان لانا اور طاغوت سے کفر کرنا لازم وملزوم ٹھیرتا ہے۔ یہاں امر بالمعروف تنہا نہیں کیا جا سکتا بلکہ نہی عن المنکر بالکل متوازی طور پر کرنا پڑتا ہے۔ یہاں "الا اللہ" کہنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے "لا الٰہ" پکارا جائے۔

اسلامی تحریک جب بھی رونما ہوتی ہے تو وہ عوام کے سوچنے کا رُخ بدلنے کے لیے وقت کے تمدن، اجتماعی ماحول، سیاسی ومعاشی نظام اور پھر خاص طور پر مروّجہ افکار ومعتقدات اور پیمانہ ہائے قدر پر کڑی تنقید کرتی ہے۔ مذہبی، سیاسی اور معاشی لحاظ سے ان پیشِ رو طبقوں کے افکار و اعمال کی حقیقت وہ لازماً کھول دیتی ہے جو عوام کو اپنی غلامی کے جال میں پھانس کے مزے اڑاتے ہیں اس کے لیے چارۂ کار ہی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ زندگی کی قیادت کرنے والوں کا پول وہ عام انسانوں کے سامنے اچھی طرح کھول دے جب تک فاسد کو فاسد، باطل کو باطل اور غلط کو غلط ثابت نہ کر دیا جائے اس کے مقابلے میں نہ سچائی اور راستی کے لیے کوئی پیاس پیدا ہو سکتی ہے اور نہ تبدیلی کی امنگ اُبھر سکتی ہے۔ ہر وہ دعوت جو نظامِ زندگی میں تبدیلی چاہتی ہو، تنقید کے نشتر سے بے نیاز نہیں ہو سکتی کسی بھی نبی کی دعوت اور رودادِ کار کو لیجیے، آپ دیکھیں گے کہ نہ صرف معاشرے کے فاسد

تصورات و احوال کو نشانۂ تنقید بنایا گیا ہے بلکہ ہر نبی نے وقت کے جبابرہ کو ٹھیک ان کے درباروں میں جا کر غلط رو اور غلط کار کہا ہے۔ یہاں تو نظام تمدن کی ساخت کو سامنے رکھ کر یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ ہر بستی، قوم اور ملک میں کچھ "اکابر مجرمین" پائے جاتے ہیں جو مکارانہ سیاست سے اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں (الانعام-۶:۱۲۴)- ان کو ان کے مناصب پر قائم رکھ کر کوئی اصلاح نہیں کی جا سکتی۔

اسلام جب عربوں کے درمیان جاہلیت کے نظام کو مٹانے اور تاریخ میں نئے زریں باب کا افتتاح کرنے اٹھا تو اس نے جھوٹ اور ظلم اور فساد کی ہر ہر شکل پر بغیر کسی رحم کے تنقید کی اور وقت کے جتنے بھی عناصر جاہلی نظام اور طاغوتی ماحول کے رہبر اور پاسبان اور کارپرداز بن کر معاشرے پر مسلط تھے اور جو اپنے مرتبے اور مفاد کے تحفظ کے لیے فلاحِ انسانی کے پیغام کا مقابلہ کرنے اٹھ کھڑے ہوئے تھے ان سب کا پول ایسی چیرہ دستی سے کھولا کہ ان کے ناپاک کرداروں کے بدن پر اعزازات کی معنوی پوشاکوں کا ایک تار بھی لگا نہ رہنے دیا۔ جوں جوں انسانیت دشمن طاقتوں کی حقیقت معاشرے پر کھلتی گئی رائے عام میں ایک بیداری شعور پھیلتی چلی گئی اور اسی کے ساتھ ساتھ تبدیلی کی پیاس تیز ہوتی گئی۔ اسلامی تحریک کے تنقیدی محاذ نے عوام الناس میں سوچنے، سمجھنے، جانچنے، پرکھنے اور موازنہ و تقابل کرنے کی صلاحیتوں کو نشوونما دی۔ دعوت کا یہ وہ پہلو تھا جو حق و باطل، خیر و شر اور درست و نادرست میں فارق بنا۔ اسی سے قد تبین الرشد من الغی کا سماں پیدا ہوا، اسی کے ذریعے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نتھر گیا، اس کے ذریعے اندھیرے اور اجالے کا فرق کرنے والی بصارت کام کرنے لگی، اسی کے لیے زہر اور شکر کے آمیزے کا تجزیہ ہو گیا۔ فاسد طاقتوں کے مظالم کو تو اسلامی تحریک کے جاں باز اپنی جانوں پر اُف کیے بغیر سہتے رہے، لیکن ان طاقتوں کے گھٹیا کرداروں سے خوشنما پردے اٹھانے میں انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ان کے کام کے خطوط سیاست و قوت کے دائروں سے باہر ہی باہر سے نہیں گزرتے تھے کہ وہ جاہلی نظام کی مذہبی و سماجی قیادتوں کو یہ اطمینان دلا کر اپنا فرض انجام دے سکتے کہ تم بخیت ہو کر اپنے منصبوں اور مرتبوں پر بیٹھے رہو، ہم اللہ والے تمہارے کسی مفاد سے تعرض کرنے والے

نہیں ہیں، ہمیں تو بس خدا کا نام لینا ہے اور اس کا کلمہ لوگوں کو سکھانا ہے۔ ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ان قیادتوں کے سامنے شانِ انکسار سے کچھ خوشامدانہ باتیں کر کے، ان کو دم دلاسہ دلا کر اور ان کی گرفت سے بچ بچا کر اس انقلابی کلمۂ حق کو پکار کر سکتے جس کا واضح منتہا نظامِ قسط کی اقامت تھا۔

اسلامی تحریک نے عین اپنے داعیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک کو اس تلخ فریضہ کی انجام دہی کے لیے استعمال کیا اور سماج کے پھوڑوں کو چیرا دینے کے لیے ٹھیک الہامی الفاظ سے نشتروں کا کام لیا۔ یہ تنقید مجرد اصول و تصورات ہی تک محدود نہ تھی بلکہ مزاحم ہونے والے با اثر طبقات اور حریف افراد سب ہی اس کی زد پر آئے اور بار بار آئے۔ یہ تنقید روزمرہ کے واقعاتی پس منظر کے ساتھ کی جاتی تھی اور جو کچھ اقدامات اور کارروائیاں مخالف کیمپ کی طرف سے ہوتی تھیں ان سب کا تجزیہ ساتھ کے ساتھ کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح سے عوامی شعور کو تیار کیا گیا۔ یہ کام اگر نہ کیا جاتا تو کچھ پاکباز افراد اور نیکی کے کچھ محیّر العقول مجسمے ممکن تھا کہ تیار ہو جاتے اور وقت کی دنیا بھی ان کو خراجِ عقیدت پیش کرتی اور بعد کے لوگ بھی عجائب خانہ تاریخ میں ان کی یادگاری تصاویر دیکھتے تو عش عش کرتے لیکن ماحول کا سارا دریا جوں کا توں یخ بستہ رہتا اور جاہلیت کی اندھیاریاں اس کو بدستور محیط رہتیں۔ نہ اندھیرے کا جگر چیرا جا سکتا اور نہ اس دریا کی زیرِ آب خوابیدہ موجوں کو جگایا جا سکتا۔ ممکن ہی نہ تھا کہ عوام میں انقلابی شعور پیدا ہوتا اور کارکنانِ اسلام کے اندر کشمکش کے رجحانات ابھرتے۔ پھر تو بات غارِ حرا پر ہی ختم ہو جاتی، کجا کہ کلمۂ حق عرب کا فاتح بن کر مکہ میں داخل ہوتا۔

محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو قرآن کی الہامی زبان میں تنقیدیں کر کے وقت کے اکابر کو نہ صرف عقل و دلیل کے لحاظ سے دیوالیہ ثابت کر دیا، بلکہ اخلاق و کردار کے لحاظ سے بھی زمانے پر یہ راز کھول دیا کہ مرعوب کن اور نظر فریب پردہ ہائے عظمت و سیادت میں نہایت مکروہ غلاظتوں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ اسی تنقید نے عوام میں یہ احساس پیدا کیا کہ جب تک تحریکِ اسلامی سے تعاون کر کے ان طاقتوں کو زندگی کی قیادت سے برطرف نہ کر دیا جائے، زندگی سنورنے کا کوئی امکان نہیں ہے

قریش کو لیا تو ان کی بت پرستی، ان کے اوہام، ان کے مضحکہ انگیز مذہبی رسوم، ان کی اخلاقی پستی اور ان کے زعمِ سیادت سارے ہی پہلوؤں سے کھولنے کی ہر بات کھول دی۔ ان کے محبوب معبودوں کی بے بسی کو واضح کرنے کے لیے مثال دے کے بتایا کہ یہ سب کے سب مل کر بھی ایک مکھی تک خلق کرنے سے عاجز ہیں، بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز اڑا لے جائے تو یہ اس سے واپس لینے کی مجال بھی نہیں رکھتے۔ حضرت ابراہیمؑ کے نام لیوا ہونے پر ان کو جو فخر تھا اس کو یوں توڑا کہ حضرت ابراہیمؑ کے پورے کارنامۂ حیات کو بار بار ان کے سامنے پیش کر کے دکھایا کہ جس مشن کے لیے انہوں نے اپنی پوری زندگی کھپا دی تھی، گھر بار چھوڑا، پیری کی گدی پر لات ماری، نمرود کے سامنے بغاوت کے مقدمہ میں ملزم بنائے گئے اور زندہ جلائے جانے کی سزا تجویز ہوئی، پھر وہ اپنے رب کے لیے مہاجر اور خانہ بدوش بنے، پھر انہوں نے ایک اجاڑ وادی میں آکر اپنی دعوت اور خدا کی عبادت کا یہ مرکز قائم کیا جسے اب تم نے اپنی کمائی اور مذہبی پیشوائی کا ذریعہ بنا رکھا ہے ــــ اب تم کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اس موحدِ حنیف کے تم نام لیوا اور جانشین بن بیٹھو، درآنحالیکہ تمہارا بال بال شرک اور جاہلیت کے بندھنوں میں بندھا ہوا ہے۔ پھر دکھایا کہ کیسے تم لوگوں نے حلال و حرام کی ایک انوکھی شریعت گھڑ رکھی ہے۔ دکھایا کہ تم نے استھانوں پر چڑھاوں کے لیے کیسے کیسے ضابطے رکھے ہیں، دکھایا کہ پانسے پھینکنے اور قمار بازی کرنے کو بھی تم نے رنگ تقدس دے رکھا ہے۔ دکھایا کہ کس طرح تم بیٹیوں کی پیدائش پر منہ چھپاتے پھرتے ہو اور سنگدل بن کر ان کو مٹی کے انباروں میں زندہ دفن کر دیتے ہو، اور پھر تمہیں خدا کے ساتھ بیٹیوں کو منسوب کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اسی طرح جب کشمکش چھڑی تو ان کی لایعنی باتوں اور خفیف الحرکتیوں میں سے ایک ایک کو ان کے سامنے رکھ کر دکھایا کہ ذرا اپنے کردار کی شکلیں دیکھو۔ ان کے جرائم ان کے سامنے گنوا کے کہا کہ تم مسجدِ حرام کی تولیت پر نازاں ہو حالانکہ اپنے کفر و شرک کی بنا پر تم اس منصب کے مستحق ہی نہیں ہو۔ تم نے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا، تم نے کعبہ کے دروازے بندگانِ حق پر بند کیے، تم نے اپنے بھائی بندوں کو جلا وطن کیا اور تم نے دین کی راہ میں فتنہ انگیزی کو اپنا شعار بنا لیا۔

پھر اہلِ کتاب کو لیا تو ان کا صدیوں کا نامۂ اعمال کھول کے ان کے سامنے رکھ دیا کہ کس طرح تم

پیروانِ موسیٰ نے خود موسیٰ علیہ السلام کو قدم قدم پر اذیت دی تھی، بار بار نافرمانیاں کیں، بار بار بگاڑ کے راستوں پر پڑتے رہے۔ تم نے جھگڑے کیے، فساد اٹھائے، بچھڑے کی پوجا کی، جہاد سے جی چرایا، پھر آپس میں خون خرابے کیے، اپنے بھائی بندوں کو بے خانماں کرتے رہے، ان کے خلاف ظلم و عدوان کے ساتھ دھاما بولتے رہے۔ تم نے انبیاء کو جانتے بوجھتے جھٹلایا، قتل کیا اور ان کی پاک سیرتوں پر دھبے ڈالتے رہے، تم نے کتابِ الٰہی میں تحریف کی، حق بات کو ہمیشہ چھپایا، اور احبار و رہبان کو اپنا معبود بنا لیا۔ حد یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں سے طرح طرح کی باتیں لکھ کر ان کو خدا سے منسوب کرتے ہو اور خلقِ خدا کو فریب دے دے کر حرام کمائیاں سمیٹتے ہو، نہ خود راہِ حق پر چلتے ہو نہ دوسروں کو چلنے دیتے ہو اور کوئی دوسرا اگر انسانی فلاح کا کام کرنے اٹھتا ہے تو اس کے ساتھ تعاون کے بجائے اس کے راستے میں کانٹے بچھاتے ہو۔ کل تک تم خود خدائی نوشتوں کی بنا پر زمانے بھر کو مژدہ سناتے رہے ہو کہ نبیٔ آخر الزماں آنے والا ہے اور جب وہ واقعی آپہنچا تو تم اس کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ مسلم جماعت جو بہت سے وجوہ سے تم سے اقرب ہے اور تمہارے سارے انبیاء اور پہلے کی ساری کڑیوں کو مانتی ہے اس کے مقابلے میں تمہارا قارورہ اگر ملتا ہے تو اربابِ شرک سے جا کر ملتا ہے۔ ان کرتوتوں کو کرتے ہوئے خدا کی کتاب برابر تمہاری پیٹھوں پر لدی رہی، ـــ بالکل ایسے کہ جیسے کسی گدھے پر علم کے دفتر لدے ہوں اور وہ ان سے بے خبر چلا جا رہا ہو۔ تم اگر سچے ہوتے تو اپنی زندگیوں پر تورات کو قائم کر کے دکھاتے۔ جب تک تم نے کتابِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے، تمہارے خوشنما دعووں کی کچھ بھی وقعت نہیں ہے۔ آج تمہاری تعدادِ کثیر اس حالت کو آپہنچی ہے کہ ایک دمڑی بھی اگر ان کے پاس امانت رکھوائی جائے تو ان کی خیانت سے بچ کر وہ مشکل ہی سے واپس مل سکتی ہے۔ اپنے اس رویّے کی وجہ سے تم نے خدا کا غضب سہیڑا اور تم پر ذلت و مسکنت چیپک دی گئی۔

پھر منافقین کو پکڑا تو ان کا پورا پورا نفسیاتی تجزیہ کر کے انہیں دکھایا کہ تم کس ٹیڑھے زاویے سے ہر معاملے کو سوچتے ہو۔ تنہائی میں بیٹھتے ہو تو تحریک کے حالات و واقعات پر کس انداز سے الٹے تبصرے کرتے ہو، مجالس میں آتے ہو تو تمہارا ڈھنگ کیا ہوتا ہے اور کس کس طرح باہم دگر اشارے کرتے ہو،

کبھی لکڑی کے کندوں کی طرح ساکت ہو جاتے ہو اور تمہاری آنکھیں پتھرائی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، کبھی چپکے سے ٹسک جاتے ہو، مسلم جماعت میں ہوتے ہو تو اور طرح سے زبان چلاتے ہو اور پھر دشمنوں میں جا بیٹھتے ہو تو دوسرا ہی راگ الاپتے ہو۔ ہر معاملے میں تمہارا رویہ جماعت سے الگ الگ اور مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔ دوسروں کو اگر نغمۂ الہام سے درسِ حیات اور سرمایۂ تسکین ملتا ہے تو تمہارے دل اسے سن کر کھنچنے لگتے ہیں، دوسروں کے لیے رسول پاکؐ کا وجود مرکزِ محبت بنا ہوا ہے اور تم اپنے آپ کو دور دور رکھنا پسند کرتے ہو، دوسروں کا جذبہ دروں انہیں نماز کے لیے کھینچ کھینچ کے لاتا ہے اور تم ہو کہ بے دلی سے کسمساتے ہوئے آتے ہو جیسے مارے باندھے کوئی بیگار آدمی کو پوری کر دینی ہو، دوسرے اپنا سب کچھ تحریک کے قدموں پر نچھاور کرنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں اور تم ہو کہ خود بھی خرچ نہیں کر سکتے اور اوروں کو بھی روکتے ہو، دوسرے اپنے نصب العین کی خاطر دل کی امنگ سے جہاد کے لیے نکلتے ہیں لیکن تم ہمیشہ جان بچانا چاہتے ہو اور عذر گھڑ گھڑ کے راہِ فرار نکالتے ہو۔ دوسروں کے لیے جس واقعہ میں خوشی کا پہلو نکلتا ہے اس سے تمہارے دل ملول ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو جن حالات میں تکلیف پہنچی ہے تم ان پر گھی کے چراغ جلاتے ہو۔ جماعت کے ساتھ کسی طرف سے بھی تمہارا جوڑ نہیں لگتا۔ گویا اسلامی تحریک نے ہر منافق کے سامنے اس کی تصویر کھینچ کے رکھ دی کہ اپنے خد و خال ملاحظہ فرما لیجیے۔

جاہل شعراء جو تحریکِ اسلامی کے خلاف فن کا محاذ آراستہ کیے ہوئے تھے اور خود اس کے داعیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہجو یہ کلام لکھ لکھ کر اسے شائع کرتے رہتے تھے، ان کو بھی لیا گیا۔ چند الفاظ میں ان کا ایسا نقشہ کھینچا گیا کہ جو پوری طرح ان پر راست بھی آتا تھا اور جسے دیکھ کر عرب کا عام آدمی خود اس نقشہ کی پستی کا اندازہ بھی کر سکتا تھا۔ جاہل شعراء کی شان یہ بتائی گئی کہ یہ وہ عنصر ہے جس کے گرد جمع ہونے والے اور جس کی امامت میں چلنے والے صرف گم کردہ راہ لوگ ہیں پھر یہ وہ عنصر ہے جو اپنے بے اصولے پن کی وجہ سے ہر ہر وادی میں آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے، پھر یہ وہ عنصر ہے جو زبان سے وہ باتیں کہتا ہے جن کے مطابق اس کا اپنا عملی کردار نہیں رہا ہے۔

پھر اسلامی تحریک نے وقت کے خاص خاص گھناؤنے کرداروں کو چھانٹ کر کسی نام کے بغیر ان کی تصویریں اعلیٰ درجہ کے آرٹ کے ساتھ مطابقِ حقیقت ادبی رنگوں سے تیار کیں اور سماج کے عوامی شعور کے ایوان میں آویزاں کر دیں تاکہ ہر کوئی ان کو دیکھے، ان کو سمجھے اور ان کو واقعاتی دنیا میں خود پہچانے۔ کہیں اس کردار کو دکھایا جو اپنے باتونی پن کے زور سے لوگوں کو مرعوب کر لیتا ہے لیکن عمل کے میدان میں اپنی خوشنما باتوں کو پامال کر کے انسانی سماج میں فتنہ انگیزی کرتا اور تباہی کی آگ لگاتا ہے۔ کہیں اس کردار کو بے نقاب کیا جو اپنے خاندانی اور خاندانہ غرور کے نشے میں بدمست رہتا ہے اور اپنی عزت کے حد سے بڑھے ہوئے احساس نے اس کی ناک کو اتنی اہمیت دے دی ہے کہ وہ گویا ہاتھی کے سونڈ کے مماثل ہو گئی ہے ۔۔ اور قیامت کے دن ٹھیک اس سونڈ پر داغ دے کر اسے سزا دی جائے گی۔ کہیں اس انسانی کردار کو دکھایا کہ جس کی ہوسِ دنیا نے اسے کتے کی سی عادتوں پر لا ڈالا ہے، جسے دھتکارو تو بھی زبان لٹکا دیتا ہے اور چھوڑ دو تو بھی زبان لٹکا دیتا ہے۔ یہ کردار سماج میں موجود تھے اور چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے، ان ناقدانہ تصاویر کی وجہ سے ان کو پہچاننا اور ان کی پستی کا شعور حاصل کرنا عوام کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔

یہ تنقید محض نظری نہ تھی، واقعاتی کشمکش کے ساتھ متعلق تھی اور اس میں یہ بہر حال تحریکِ اسلامی کے محاذ سے مخالف طاقتوں کو مخاطب کیا جاتا تھا۔ سنانے والے کو بھی معلوم تھا کہ وہ کس کو سنا رہا ہے اور سننے والوں کو بھی اندازہ ہوتا تھا کہ کون ان کی خبر لے رہا ہے۔ یہ تنقیدیں آسمان سے لاؤڈ سپیکر لگا کر نہیں سنائی جاتی تھیں بلکہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نشر ہوتی تھیں اور انہیں مسلم جماعت کے ارکان گوشے گوشے تک پہنچاتے تھے، اس لیے ان کے جذبات ان میں شامل اور ان کی روحیں ان میں حل ہوتی تھیں۔ یہ واقعاتی مدوجزر پر منطبق کر کے ہی سنائی جاتی تھیں اور سننے والے بھی ان کو زیرِ تشکیل تاریخ پر منطبق کر کے ہی سمجھتے تھے۔ عوام بھی ان کو اسی حیثیت سے لیتے تھے کہ یہ اس تعمیر پسند انقلابی طاقت کی پکار ہے جو ہمارے درمیان ابھری ہے اور قدیم نظام کو چیلنج کر رہی ہے اور اس کی زد اُن حریفوں پر پڑ رہی ہے جو انقلابی راہ میں مزاحم ہو رہے ہیں۔ ان کو توقع ملتا تھا کہ وہ دونوں طرف کی

بات سنیں اور فریقین کو تقابل پر رکھ کر جانچیں۔ اس طریقے سے ان کا شعور بنتا چلا گیا۔

دلیل شعور کی روشنی دے سکتی ہے مگر جذبات کو نہیں پکارتی، اپیل جذبات کو حرکت دلا کر دعوت میں کچھ گرمی پیدا کر دیتی ہے مگر وہ تاریخ میں عملی معرکہ پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ تنقید ہی کی طاقت ہے جو دلیل اور اپیل کے ساتھ مل کر جب کام کرتی ہے تو تمدن کے سارے معاملات گردش میں آجاتے ہیں۔ صرف یہی طاقت ہے کہ وقت کے سمندر میں مدوجزر پیدا کر دیتی ہے۔

خلاصہ مدعا یہ کہ اسلامی تحریک نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے دلیل، اپیل اور تنقید کے سہ گانہ عناصر سے کام لیا اور تئیس برس تک مسلسل کام لیا۔ انہی سہ گانہ طاقتوں نے حریفوں کو بھی محسوس کرا دیا کہ تم علمی و عقلی لحاظ سے فرومایہ، استدلال کے لحاظ سے کمزور، اپنے مقاصد کی جذباتی کشش کے لحاظ سے پسماندہ اور اپنے کردار کے لحاظ سے بہت ادنیٰ سطح پر ہو۔ مخالفین میں مسلم جماعت کی برتری کا اعتراف اور اپنی کہتری کا احساس غیر شعوری طور پر بڑھتا ہی چلا گیا اور دوسری طرف رائے عام بھی فریقین کو ہر پہلو سے جانچ کر ان کا فرق سمجھتی تھی۔ دعوت کی یہ وہ اصل طاقتیں تھیں جنہوں نے عرب کے لاکھوں باشندوں کو مفتوح کر دیا۔ دعوت اگر برحق نہ ہوتی، روحوں کے لیے جاذب نہ ہوتی، اپنے علمبرداروں کو متحرک کر کے رزمِ خیر و شر میں اتار نہ سکتی اور دلیل، اپیل اور تنقید کے ذریعے اپنا لوہا منوا نہ لیتی تو مسلم جماعت نہ سیاسی حکمت کے دائرے میں بازی جیت سکتی تھی اور نہ میدانِ جنگ میں کوئی معرکہ سر کر سکتی تھی۔ ان جزوی میدانوں میں بھی اگر جیت ہوئی تو اس وجہ سے ہوئی کہ رائے عام کے وسیع محاذ پر اسلام کی پیش قدمی بڑی ہی فاتحانہ تھی۔

رسائل و مسائل

"ایک تفسیری سوال"

سوال: قرآن شریف کا مطالعہ کرتے وقت بعض ایسے قوی شبہات و شکوک طبیعت میں پیدا ہو جاتے ہیں جو ذہن کو کافی پریشان کر دیتے ہیں۔ ایک طرف تو نقص ایمان کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں قرآن کی آیات پر نکتہ چینی و اعتراض کرنے سے ایمان میں خلل نہ واقع ہو جائے لیکن آیت کا صحیح مفہوم و مطلب نہ سمجھ میں آنے کے باعث شک میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ میں ان آیات کا مطلب سمجھنے کے لیے اردو و عربی تفاسیر کا بغور مطالعہ کرتا ہوں لیکن طبیعت مطمئن نہیں ہوتی اور اضطراب دور نہیں ہوتا تو پھر گاہ گاہ جناب کی طرف رجوع کرتا ہوں مگر آپ کبھی مختصر جواب دے کر ٹال دیتے ہیں، البتہ آپ کے مختصر جوابات بعض اوقات تسلی بخش ہوتے ہیں۔ آج صبح کو میں حسب دستور تفسیر کا مطالعہ کر رہا تھا۔ سورۂ یٰسین زیر مطالعہ تھی کہ مندرجۂ ذیل آیت پر میں ٹھہر گیا: لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (تاکہ تم ڈراؤ ان لوگوں کو جن کے آبا واجداد نہیں ڈرائے گئے تھے پس وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں)۔ اس کی تفسیر میں یہ الفاظ تحریر تھے: لان قریش لم یاتهم نبي قبل محمد صلی اللہ علیہ وسلم (کیونکہ قریش کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی نبی نہیں آیا تھا)۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ قبل از بعثت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب کہ سرزمین عرب میں کوئی نبی و رسول مبعوث نہیں ہوا تو پھر کیا یہ لوگ اصحاب الجنۃ ہونگے یا اصحاب النار یا اصحاب اعراف میں سے ہونگے؟ اسی مضمون کی کچھ اور آیات بھی قرآن مجید میں موجود ہیں۔ عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ

جن قوموں پر اتمام حجت نہیں ہوا وہ بری الذمہ ہونی چاہییں۔ البتہ وہ لوگ جن کے کانوں تک پیغمبر اسلامؐ کی دعوت پہنچ چکی ہو، پھر وہ ایمان سے منہ موڑیں تو یہ لوگ واقعی معتوب ہونے چاہییں۔

ایک دوسری آیت اسی مقصد کی تائید کرتی ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ رسول نہ بھیج دیں)،

اسی طرح ایک اور الجھن بھی ہے۔ امید ہے کہ آپ اسے بھی حل فرما دیں گے۔ کیا دل اور عقل ایک ہی چیز ہیں یا ان دونوں کے وجود الگ الگ ہیں؟

جواب۔ قرآن مجید سے جو اصولی بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پکڑ اسی شخص اور گروہ کی ہوگی جسے دعوتِ حق پہنچی ہو۔ اب یہ بات کہ دعوت کس کو پہنچی اور کس کو نہیں پہنچی، اور کون بے خبر ہے اور کون باخبر، اسے اللہ تعالیٰ خود ہی جانتا ہے اور وہی اس کا فیصلہ کرے گا۔ یہ سوال ہم سے متعلق ہی نہیں ہے۔ پھر ہم کیوں اس کا فیصلہ کرنے بیٹھ جائیں؟ اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا کہ کس کو کب، کہاں اور کس شکل میں دعوت پہنچی ہے، اور اس نے اگر اس دعوت کو قبول نہیں کیا ہے تو کیوں نہیں کیا ہے۔ اور کون ہے جسے دعوت کبھی کسی حد تک بھی نہیں پہنچی۔ نیز یہ بھی اللہ ہی جانتا ہے اور وہی اس کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس سے کس بات کی باز پرس کرنی ہے اور کس بات کے لیے وہ مسئول نہیں ہے۔ اس لیے ان سوالات کے حل کرنے میں ہمیں اپنے دماغ کو بلاوجہ پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں تو دراصل فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ ہم تک دعوت پہنچ چکی ہے اور ہم کو اپنی جواب دہی لازماً کرنی ہوگی۔ نیز جن لوگوں کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ ان کو دعوت نہیں پہنچی ان کو پہنچانے کی ذمہ داری بھی ہم پر عائد ہوتی ہے۔

قرآن جسے قلب یا فواد کہتا ہے وہ بالکل عقل کا ہم معنی نہیں ہے بلکہ عقل اس کے مددگاروں میں سے ایک ہے۔ اصل میں فواد سے مراد وہ چیز ہے جو انسان کے اندر کسی چیز کے اخذ و ترک کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس فیصلے میں حواس، علم، عقل، جذبات، خواہشات سب

اس کے مددگار ہیں۔

شیطان کی حقیقت

سوال۔ لفظ شیطان کی ماہیت کیا ہے جو قرآن میں متعدد مقامات پر مذکور ہے اور یوں بھی عام فہم زبان میں استعمال ہوتا ہے؟ کیا شیطان ہم انسانوں جیسی کوئی مخلوق ہے جو زندگی و موت کے حوادث سے دوچار ہوتی ہے اور جس کا سلسلہ توالد و تناسل کے ذریعہ قائم ہے؟ کیا یہ بھی ہماری طرح ہم آہنگی میں مربوط ہوتی ہے جس طرح سے ہم کھانے کمانے اور دیگر لوازمات زندگی میں مشغول رہتے ہیں؟ اس کے انسان کو دھوکا دینے کی کیا قدرت ہے؟ کیا یہ اعضائے جسمانی میں سرایت کر جانے کی قدرت رکھتی ہے اور اس طرح انسان کے اعصاب و محرکات پر قابو پالیتی ہے اور بالجبر اسے غلط راستے پر لگا دیتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر دھوکا کیسے دیتی ہے۔

یا شیطان عربی زبان کی اصطلاح میں محض ایک لفظ ہے جو ہر اس فرد کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو تخریبی پہلو اختیار کرے۔ یا یہ انسان کی اس اندرونی جبلت کا نام ہے جسے قرآن نفسِ امارہ یا نفس لوامہ کے الفاظ سے تشبیہ دیتا ہے۔ یعنی نفس جو غلط کاموں کی طرف اکساتا ہے۔ چونکہ شیطان کا حربہ بڑا خطرناک ہوتا ہے اس لیے اس سے بچنے کی خاطر یہ سوال پوچھا جا رہا ہے۔

جواب۔ شیطان کے متعلق میرے پاس کوئی ذریعہ معلومات قرآن اور حدیث کے سوا نہیں ہے۔ اس ذریعہ سے جو کچھ معلوم ہے وہ یہ ہے کہ شیطان محض کسی قوت کا یا انسان ہی کے کسی رجحان کا نام نہیں ہے بلکہ وہ جنوں میں سے ہے اور جن ہماری طرح ایک مستقل مخلوق ہے جس کا ہر فرد افراد انسانی کی طرح ایک شخصیت (PERSONALITY) رکھتا ہے۔ اس کی معیشت

اور اس کے مشاغل اور توالد و تناسل وغیرہ کے متعلق ہم کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ اس کو ہمارے جسم پر قبضہ کر کے ہم سے بالجبر کوئی کام کرا لینے کے اختیارات نہیں دیئے گئے ہیں۔ وہ صرف ہمارے نفس کو ترغیب دینے، اکسانے اور بُرے کاموں کی طرف مائل کرنے یا وساوس اور شبہات ڈالنے کا کام کر سکتا ہے۔ اور ہم چاہیں تو اس کی ترغیبات کو رد کر کے اپنے ارادے سے ایک راہ اختیار کر سکتے ہیں

لفظ فطرت کا مفہوم

سوال۔ ایک لفظ "فطرت" کا استعمال بہت عام ہے۔ آخر فطرت ہے کیا چیز؟ کیا یہ انسان کی خود پیدا کردہ چیز ہے؟ یا فطرت انسان کی ان پیدائشی صلاحیتوں کا نام ہے جو وہ ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے؟ کیا فطرت انسان کی اپنی جدوجہد سے اچھی یا بُری بن سکتی ہے یا انسان اس معاملہ میں بالکل مجبور ہے؟ اگر نہیں تو کیا فطرت کے نقائص جدوجہد کے ذریعہ دُور کیے جا سکتے ہیں؟ یہ سوال میری اپنی ذات سے متعلق ہے۔ میری فطرت انتہائی ناقص ساخت کی معلوم ہوتی ہے جس کے اثرات میری گھٹی میں سمائے ہوئے ہیں اور باوجود انتہائی کوششوں کے دُور نہیں ہوتے۔ اس لیے آپ سے استدعا ہے کہ مجھے کوئی مشورہ دیں۔

جواب۔ فطرت کے اصل معنی ساخت کے ہیں، یعنی وہ بناوٹ جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے ہر ایک جنس، نوع اور فرد کو عطا کی ہے اور وہ صلاحیتیں اور قوتیں جو اس نے ہر ایک کی ساخت میں رکھ دی ہیں۔ ایک فطرت بحیثیت مجموعی "انسان" کی ہے جو پوری نوع انسانی میں پائی جاتی ہے۔ ایک فطرت ہر ہر انسانی فرد کی جدا جدا بھی ہے جس سے ہر ایک کی الگ الگ مستقل شخصیت و انفرادیت تشکیل پاتی ہے۔ اور اسی فطرت میں وہ قوتیں بھی شامل ہیں جن کو استعمال کر کے اپنے آپ کو درست کرنے یا بگاڑنے، اور دوسروں کے مفید یا مضر اثرات کو قبول یا رد کرنے

کی قدرت انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے نہ تو یہ کہنا درست ہے کہ انسان اپنی فطرت کو بنانے یا بدلنے پر کامل قدرت رکھتا ہے اور نہ یہ کہنا درست ہے کہ وہ بالکل مجبور ہے اور کوئی قدرت اس کو سرے سے حاصل ہی نہیں ہے۔ بات ان دونوں کے درمیان ہے۔ آپ کوشش کر کے اپنی بعض فطری کمزوریوں کی اصلاح بھی کر سکتے ہیں اور یہ اصلاح کی قدرت بھی آپ کی فطرت ہی کا ایک حصہ ہے۔ آپ نے اپنی جن کمزوریوں کا ذکر کیا ہے، اپنے نفس کا جائزہ لے کر اچھی طرح ان کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ پھر اپنی قوتِ فکر وفہم، قوتِ تمیز اور قوتِ ارادی سے کام لے کر بتدریج ان کو گھٹانے اور اعتدال پر لانے کی کوشش کرتے چلے جائیں۔ آپ کا یہ کہنا کہ میرے اندر یہ کمزوریاں ہیں خود اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ انہیں محسوس کرتے ہیں۔ اب جس وقت بھی ان میں سے کسی کمزوری کا ظہور شروع ہو اور آپ کو محسوس ہو جائے کہ اس کمزوری نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا ہے اسی وقت اپنی ارادی قوت کو اس کی روک تھام کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیجیے اور اپنی قوتِ فکر وفہم اور قوتِ تمیز سے کام لے کر معلوم کیجیے کہ نقطۂ اعتدال کون سا ہے جس کی طرف اپنے آپ کو موڑنے اور آگے بڑھانے کے لیے آپ اپنی ارادی طاقت استعمال کریں۔

فتنۂ تصویر

سوال۔ آج کل تصویروں اور فوٹوگرافی کا استعمال کثرت سے ہے۔ زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں ان کا استعمال ایک تہذیبی معیار بن گیا ہے۔ بازار کی دوکانوں میں، مکانوں کے ڈرائنگ روموں میں، رسالوں کے سرورق پر، اخباروں کے کالموں میں، غرضیکہ جس طرف بھی نگاہ اٹھتی ہے اس لعنت سے سابقہ پڑتا ہے اور بعض اوقات توجہ مبذول ہو کے رہتی ہے۔ کیا نسوانی تصویروں کو بھی پوری توجہ کے ساتھ دیکھنا گناہ ہے۔

جواب۔ تصویروں کا فتنہ فی الواقع ایک بلائے عام بلکہ سیلاب بلا کی صورت اختیار

کر گیا ہے جس کا کوئی علاج میرے علم میں اس کے سوا نہیں ہے کہ بحیثیت مجموعی نظامِ زندگی میں تغیر واقع ہو اور اس نظام کی زمام کاران لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جو معاشرے میں تمام منکرات کے ظہور کو روک دیں۔ جب تک یہ سیلاب امنڈ رہا ہے، جو شخص جس حد تک بھی اس سے بچ سکتا ہو بچنے کی کوشش کرے۔ نسوانی تصویروں کے ساتھ بھی وہی غضِ بصر کا معاملہ کرنا چاہیے جو خود عورتوں کے لیے شریعت نے لازم کیا ہے، کیونکہ جیتی جاگتی عورت کو گھورنے اور اس کی تصویر کو دیکھنے کے اثرات و نتائج قریب قریب یکساں ہیں۔

قرآن اور سائنس

سوال۔ مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت اس بات کو صحیح قرار دیتی ہے کہ قرآن میں بعض باتیں ایسی درج ہیں جو سائنس کے بالکل خلاف ہیں۔ بہت سے اصحاب علم کا کہنا ہے کہ قرآنِ پاک میں زمین کی گردش کا کہیں نام و نشان تک نہیں، بلکہ سورج کا گردش کرنا ثابت ہے۔

جواب۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ قرآن میں کوئی بات سائنس کے ثابت شدہ حقائق سے ٹکراتی ہے۔ سائنس دانوں کے نظریات اور مفروضات سے تصادم اور چیز ہے اور حقائق و امورِ واقعیہ سے تصادم اور چیز۔ پہلی چیز سے تصادم کی ہمیں کوئی پرواہ نہیں، لیکن دوسری چیز سے تصادم کی کوئی مثال اگر کسی کے علم میں ہو تو ہمیں بتائیے۔ زمین کی گردش کے بارے میں آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن پاک نہ اس کی حرکت کی صراحت کرتا ہے نہ سکون کی۔ البتہ بعض مقامات پر ضمناً جو اشارات نکلتے ہیں ان سے حرکت ہی کے تصور کو تقویت ملتی ہے۔ رہا سورج تو یہ خیال خود سائنس میں بہت پرانا ہو چکا ہے کہ وہ ساکن ہے۔ اب تو ہیئت دان خود کہتے ہیں کہ وہ اپنے پورے نظامِ شمسی کو لیے ہوئے حرکت کر رہا ہے۔

تفسیرِ قرآن کے اختلافات

سوال: قرآن پاک کی مختلف تفسیریں کیوں ہیں؟ آنحضور نے جو تفسیر بیان کی ہے بہی ہو بہو کیوں نہ لکھ لی گئی؟ کیا ضرورت ہے کہ لوگ اپنے اپنے علم کے اعتبار سے مختلف تفسیریں بیان کریں اور باہمی اختلافات کا ہنگامہ برپا رہے۔

جواب۔ قرآن پاک کا جو فہم دین کے حقائق اور اس کے احکام جاننے کے لیے ضروری تھا اس کی حد تک تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ارشادات اور اپنے عمل سے اس کی تفسیر فرما گئے ہیں، لیکن ایک حصّہ لوگوں کے غور خوض اور فکر و فہم کے لیے بھی چھوڑا گیا ہے تاکہ وہ خود بھی تدبّر کریں۔ اس حصّے میں اختلافات کا واقع ہونا ایک فطری امر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا منشا اگر یہ ہوتا کہ دنیا میں سرے سے کوئی اختلاف ہو ہی نہیں تو وہ تمام انسانوں کو خود ہی یکساں فہم عطا فرماتا، بلکہ عقل و فہم اور اختیار کی قوتیں عطا کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اور اس صورت میں آدمی کے لیے نہ کوشش کا کوئی میدان ہوتا نہ ترقی و تنزل کا کوئی امکان۔

مذہب کی آڑ میں استعماریت

(بقیہ ص۲۹۲)

میں استفہام انکاری کو استفہام عادی سمجھتے ہوئے اس کی عجیب وغریب توجیہ کی ہے۔
عربی زبان سے واقفیت رکھنے والا انسان تو کیا کسی زبان کا ستھرا ذوق رکھنے والا شخص بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہاں جو استفہام استعمال ہوا ہے وہ انکاری نہیں بلکہ عادی ہے۔ یہ انداز بیان عام بول چال میں بھی بکثرت اختیار کیا جاتا ہے جیسے "الا تحب ان نکون من الناجحین" کیا تم کامیاب ہونے والوں میں شامل ہونا پسند نہیں کرتے۔

یہ چند مثالیں ان حضرات کے مبلغ علم اور ان کی افترا پردازیوں کا پردہ چاک کرنے کے لیے کافی ہیں۔ (باقی)

(بقیہ حاشیہ ص۲۹۷)

بننا نہیں چاہتے اور تمہارا سیدھی راہ پر آنا صرف اسی پر موقوف ہے کہ کوئی تمہیں زبردستی راہِ راست پر لائے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ نبی کے سپرد یہ کام نہیں کیا گیا ہے۔ ایسا جبری ایمان اگر اللہ کو منظور ہوتا تو اس کے لیے اُسے نبی بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ کام تو وہ خود جب چاہتا کرسکتا تھا۔"

(تفہیم القرآن جلد دوم ص۳۱۳)

M. A. Aziz Khan House no: H. 1065
Kucha Gondi Wala Chowk Wazir Kh-
Lahore

انسانی تمدن کے سب سے مقدم اور سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلے دو ہیں جن کے صحیح اور متوازن حل پر انسان کی فلاح و ترقی کا انحصار ہے۔

* پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں مرد اور عورت کا تعلق کس طرح قائم کیا جائے

* دوسرا مسئلہ فرد اور جماعت کے تعلق کا ہے۔

اول الذکر مسئلے کے بارے میں انسانی ذہن نے آج تک کیا حل تجویز کئے ہیں ؟

* قدیم یونان، روم اور مسیحی یورپ کے تمدنی نظریات نے اس کا کیا جواب دیا ؟ اور اس کے کیا عملی نتائج برآمد ہوئے ؟

* جدید مسیحی یورپ اور مغربی اقوام اس بارے میں کیا کیا ٹھوکریں کھا رہی ہیں۔ اور کس قدر خوفناک عواقب سے دو چار ہیں ؟

اس کے برعکس۔

* اسلام نے عورت کو کیا مقام دیا ہے۔ اور انسانی نظام اجتماع کے لئے کیا اصول و نظریات قائم کئے ہیں ؟

* عورت کے لئے پردے کو کیوں لازم قرار دیا ؟

* اسلامی پردے کی نوعیت اور حدود کیا ہیں ؟

آپ کو ان تمام سوالات کا جواب

سید ابو الاعلی مودودی

کی معرکۃ الآرا تصنیف **پردہ** میں تفصیل سے ملے گا۔

ضخامت : ۴۰۰ صفحات قیمت مجلد چار روپے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ترجمان القرآن

اچھرہ۔ لاہور

خالی صفحه